ASIA

ایشیا

ایڈیٹر میر مشتاق احمد

قیمت ۲۵ روپیہ

جلد ۱۱ ۷ ۳ مارچ ۱۹۶۱ء نمبر ۱۱

یہ شرمناک حرکتیں

انفرادی جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے لئے قانون سختی سے سزا دے سکتا ہے لیکن اگر انفرادی جرائم کی آڑ لے کر کسی ایک فرقہ، گروہ یا ذات کے لوگ دوسرے فرقہ کے معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خلاف "یدھ" بولنا شروع کردیں۔ اُن کے گھر جلا دیں۔ اُن کے کاروبار کو تباہ و برباد کر دیں۔ تو ملک اور سماج انتشار اور افراتفری کی نذر ہوجائے گا۔ کتنا ہی بڑا جرم ہو اس کی نوعیت کتنی ہی سنگین ہو۔ اس کی گرفت اور سزا کے لئے قانون اور حکومت موجود ہے کسی ایک فرقہ یا گروہ کو قانون ہاتھ میں لے کر لاقانونیت نہیں پھیلانی چاہیئے۔ گذشتہ سال کانپور میں ایک کانسٹیبل کی حرکت پر تمام شہر میں اسی قسم کی لاقانونیت کا مظاہرہ ہُوا۔ اب جبل پور اور اس کے گرد و نواح میں جو کچھ کیا گیا ہے۔ وہ نہایت غیر انسانی اور شرمناک حرکت ہے۔ یہ درندگی اور وحشت چینی حملہ آوروں سے کم نہیں۔ متحدہ قومیت اور ملک کی ایکتا کو اس قسم کی ظالمانہ اور جارحانہ حرکتوں سے کس قدر ناقابلِ تلافی نقصان ہُوا ہے۔ غیر فرقہ پرست عناصر اور جماعتوں کے لئے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ فرقہ پرست عناصر کے سامنے وہ اس قدر بے بس ہیں۔ کہ وہ جب چاہیں اپنی مذموم حرکتوں سے ملک اور ملک کی پوری سماج کو بدنام کریں اور مشترک اور متحدہ قومیت کے خواب کو پریشان کردیں۔

مدھیہ پردیش سرکار اور اس کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر کاٹجو سارے ملک کے سامنے اس بات کے جواب دہ ہیں کہ فوج اور پولیس کے تعین کرنے کے بعد یہ واقعات جاری کیوں رہے ؟ کیا سرکاری مشینری اس قدر نااہل اور ناکارہ ہے۔ کہ وہ ظلم کرنے والوں کا ہاتھ نہیں روک سکتی۔ اور بے گناہ انسانوں کے جان و مال کی حفاظت نہیں کرسکتی۔ ہمارا یقین ہے۔ کہ جب تک سرکاری مشینری کے اندر کام کرنے والوں کی شہ بلوائیوں کو نہ ہو۔ کہیں بلوہ نہیں ہو سکتا۔ اتنے بڑے پیمانے پر واقعات کا رونما ہونا یہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ یہ کسی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ حکومت مدھیہ پردیش کی مجرمانہ غفلت کی سزا اس کو ملنی چاہیئے۔ اور اسے برطرف کر دینا چاہیئے۔

یہ فرقہ پرست عناصر آج ہندوستان کی غیر مذہبی جمہوریت کو للکار رہے ہیں۔ یہ متحدہ قومیت اور مشترک سماج کے ان اصولوں کو چیلنج کر رہے ہیں۔ جن کو مہاتما گاندھی نے اپنے خون سے سینچا تھا۔ جن اصولوں کی بنیاد پر آج ہندوستان کی ساکھ سارے عالم میں ہے۔ یہ وہ سرمایہ ہے۔ جو جدوجہد آزادی کے شہیدوں کی قربانی کے صلہ میں ہمیں ملا ہے۔ کیا اس سرمایہ کو اس تنگ نظری اور تعصب کی بھینٹ چڑھا دیا جائے گا۔ افسوس کا مقام ہے کہ انسان دشمن عناصر کے سامنے تمام غیر فرقہ پرست عناصر اس طرح ہتھیار ڈال دیں۔ کانگو الجیریا لاؤس تبت نیپال میں انسانی قدروں کا خون ہو تو ہم آواز بلند کریں۔ لیکن ہمارے اپنے گھر میں ایسا عنصر موجود ہے۔ جو ہماری برسوں کی کمائی پر ہاتھ صاف کرنے کے درپے ہے۔ یہ وہ ہی عنصر ہے۔ جو قومیت اور وطنیت کو صرف دھرم کی چار دیواری تک محدود کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ ہی ذہنیت ہے۔ جس نے چشم زدن میں ایک ملک کے دو ملک بنا دیئے۔ اور آزادی کے علمبردار مہاتما گاندھی کے بوڑھے جسم پر گولی چلا دی۔ یہ وہ راہ ہے۔ جس پر اگر ہم چلے تو ملک کی ایکتا تار تار ہوجائے گی۔ ہمارا یقین ہے کہ انسانی تفریق کے یہ چراغ گل ہو کر رہیں گے۔ اور انسانی قدریں پھیلیں گی۔ پھولیں گی۔ حق غالب ہوگا۔ خورشید محبت چمکے گا۔ یہ تنگ نظری کی بدلیاں دور ہو جائیں گی۔ بے گناہ۔ معصوم۔ مظلوم انسانوں کا خون رائیگاں نہ جائے گا۔

ہم اپنے وطنِ عزیز کے تمام غیر فرقہ پرست عناصر سے توقع کرتے ہیں۔ کہ وہ ان تنگ نظریوں کے تاریک گھروندوں سے اپنی سماج کے افراد کو نکال کر ملک کے غیر فرقہ پرست عناصر کو دعوتِ عمل دیں۔ تاکہ ہر انسان کی عزت، جان و مال محفوظ ہو۔ اور وہ تعمیر متحدہ قومیت کا ایک سرگرم جزو بن کر متحرک نظر آئے۔ یہ ظلم۔ یہ فساد۔ سرزمین ہندوستان پر بند ہونا ضروری ہیں۔

شری جواہر لال نہرو سے ہم صرف یہ دریافت کرتے ہیں:۔

تو اِدھر اُدھر کی بات نہ کر۔ یہ بتا کہ قافلے کیوں لُٹے
تیری رہبری کا سوال ہے۔ ہمیں رہزن سے غرض نہیں

ہم جانتے ہیں۔ کہ صبر آزما عزم و ارادے ہی حالات کا رُخ بدل سکتے ہیں۔ فرقہ پرستی کے یہ جھونکے ہمارے پائے استقلال میں جنبش نہیں لا سکتے۔ نہ یہ عارضی تنگ نظری کامیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن حق و انصاف کا تقاضہ ہے۔ کہ ظالم کو سزا ملنی چاہیئے۔ تاکہ وہ مزید ظلم کو فروغ نہ دے۔ اس کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیئے۔ تاکہ دوسرے مقامات پر اس غفلت سے کوئی فائدہ نہ اُٹھائے۔ ان ظالمانہ حرکتوں کو نظر انداز کرنا اپنی جگہ خود ایک جرم ہے۔ جس سے حکومت وقت پر بھی سازش میں شریک ہونے کا شبہ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی حکومت انسانوں کی جان و مال اور عزت کی حفاظت نہیں کرسکتی۔ اور ظالم کو سزا نہیں دے سکتی۔ حق و انصاف قائم نہیں کرسکتی۔ تو وہ کسی انسان سے حمایت کا کوئی مطالبہ کرنے کا حق بھی نہیں رکھتی۔ ہم اُمید کرتے ہیں۔ کہ حکومت سخت ترین قدم اٹھا کر ہر مجرم کو سزا دے گی۔

ڈپٹی چیف منسٹر کی غیر انسانی حرکت

سوشلسٹ پارٹی کے مرکزی دفتر نے آندھرا پردیش کے گورنر کو ایک مراسلہ بھیجا ہے۔ جس میں اس بات پر احتجاج کیا ہے۔ کہ ۲۰ جنوری ۱۹۶۱ء کو ایک طالب علم ابراہیم ڈپٹی چیف منسٹر کی موٹر سے ٹکرا کر گر گیا۔ اس کے سر میں شدید ضربات آئیں۔ وہ ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ ڈپٹی چیف منسٹر کار میں موجود تھے گاڑی کو روکا نہیں گیا۔ مراسلے میں مزید کہا گیا ہے کہ چند دن پیشتر گورنر کے پائلٹ کی موٹر سائیکل سے ایک شخص مجروح ہوا۔ تو گورنر نے اپنی کار روک کر خود مجروح کو ہسپتال پہنچایا اور اس کے علاج کا انتظام کیا۔

گورنر نے انسانی ہمدردی کا نمونہ پیش کیا۔ مگر ڈپٹی چیف منسٹر نے فرعون مزاجی کا مظاہرہ کیا۔ گورنر کے اخلاق کا اثر ہر شخص پر ہُوا۔ لیکن ڈپٹی چیف منسٹر کے غیر انسانی فعل کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہُوا۔ ڈپٹی چیف منسٹر کا انسانی فرض تھا۔ کہ گاڑی روک کر مجروح کو اپنی گاڑی میں ہسپتال پہنچاتے۔ اور اس کی امداد کرتے۔ ہم تو عام ڈرائیوروں سے بھی ہمیشہ یہی توقع کرتے ہیں۔ کہ کسی ایسے حادثے کے وقت ان کو بجائے بھاگ جانے کے گاڑی روک کر مجروح کی امداد کرنی چاہیئے۔ ڈپٹی چیف منسٹر کا یہ فعل قابلِ مذمت ہے اور ان کے عہدے کے لحاظ سے اس اخلاقی جرم کی نوعیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ سوشلسٹ پارٹی کے سیکرٹری نے یہ آواز گورنر تک پہنچا کر اپنی اخلاقی بلندی کا ثبوت پیش کیا ہے۔

بونس کمیشن

لیبر وزیر شری گلزاری لال نندہ نے اس بات کو منظور کر لیا ہے کہ بونس کمیشن میں آل انڈیا مزدور انجمنوں اور مالکان کے نمائندے بھی شریک کئے جائیں گے۔ یہ فیصلہ حال ہی میں مزدور انجمنوں اور مالکان کے نمائندوں سے مل کر کیا گیا ہے۔

ہم صرف یہی گذارش کریں گے۔ کہ کمیشن کو کپڑے کی صنعت کا جائزہ لے کر کم سے کم وقت میں اس بات کا فیصلہ کر دینا چاہیئے۔ کہ مزدوروں کو کن اصولوں پر بونس ملنا چاہیئے ایک مرتبہ اصول منظور کر لئے جائیں۔ تو صنعتی کھچاؤ تناؤ کم ہو جائے گا۔ اور صنعت ترقی کرے گی۔ ٹریڈ یونین کارکن بھی تعمیری کاموں کی طرف توجہ کریں گے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کمیشن مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن وہ بہت زیادہ وقت لگا دیتے ہیں۔ جس سے بلا وجہ کھچاؤ تناؤ بڑھ جاتا ہے۔ مالکان کا یہ مطالبہ کہ کمیشن کا چیئرمین صرف سپریم کورٹ کا جج ہو ٹھیک نہیں۔ اس پر ضد کرنا بیکار ہے۔ موجودہ فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے کی ضرورت ہے۔ ٹریڈ یونین نمائندوں نے وزیر محنت کی بات تسلیم کر کے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے ہمیں اُمید ہے کہ مالکان اور مزدوروں کے نمائندگان اور کمیشن کے دیگر ممبران مل کر فیصلہ کر لیں گے۔ کہ کم سے کم پانچ سال کے لئے صنعتی امن قائم ہو۔ مزدور اور مالک مل کر سماج کی بڑھتی ہوئی ضرورت کے لئے اچھا اور سستا کپڑا مہیا کر سکیں۔ ویش کی سماج کی بھلائی کا تقاضہ ہے کہ صنعتی امن قائم کیا جائے۔ بونس کمیشن کا فیصلہ ہندوستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری کے لئے ایک اہم قدم ہوگا۔

سرورق کی تصاویر:۔

سرورق کے پہلے اور آخری صفحہ کی تصاویر کے لئے ہم ... کے شکر گذار ہیں جو مولانا آزاد کی کتاب ... سے لی گئی ہیں۔

مولانا آزاد کی زندگی ایک نظر میں

۱۸۸۸ء میں مولانا آزاد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے

• ـــ مولانا کا سلسلۂ نسب عہد اکبر کے ایک جلیل القدر عالم دین علامہ جمال الدین افغانی سے ملتا ہے۔

• ـــ مولانا آزاد کے والد کا نام مولانا خیر الدین تھا۔

• ـ مولانا کے دادا کا نام مولانا محمد ہادی تھا جو شاہجہاں کے دور میں قلعہ آگرہ کے گورنر تھے ـ

• ـــ مولانا کی والدہ مدینہ منورہ کے ایک بہت بڑے عالم دین شیخ محمد بن ظاہر وتری کی دختر تھیں

• سنہ ۱۸۹۰ء میں مولانا آزاد کے والد اپنے خاندان کو لے کر کلکتہ چلے آئے۔

• ـــ مولانا آزاد نے سولہ برس کی عمر میں زمانہ کے رواج کے مطابق فارسی اور عربی کی تعلیم مکمل کرلی تھی۔

• مولانا آزاد نے اس کے بعد مولوی محمد یوسف جعفری سے پیارے چند سرکار کی انگریزی کی پہلی کتاب پڑھی اور پھر فارسی اور اردو انجیل کی مدد سے انگریزی کی انجیل پڑھ کر اپنی انگریزی کی قابلیت بڑھائی۔

• ـــ سنہ ۱۹۰۲ء میں اخبار لسان الصدق جاری کیا

• ـــ سنہ ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ اجلاس سے خطاب کیا ـ

• ـــ سنہ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی تحریک مولانا آزاد کے سیاسی خیالات پر اثر انداز ہوئی ـ

• ـــ مسٹر شیام سندر چکرورتی نے مولانا آزاد کا انقلابی گروہ سے تعارف کرایا۔

• سنہ ۱۹۰۶ء میں الندوہ کے ایڈیٹر ہوئے ـ

• ـــ سنہ ۱۹۰۷ء میں وکیل کے ایڈیٹر رہے۔

• ـــ سنہ ۱۹۰۸ء میں مولانا آزاد نے مصر کا سفر کیا اور قاہرہ گئے۔

• ـــ مصر سے مولانا آزاد ترکی اور فرانس گئے مگر والد کی بیماری کے باعث پیرس ہی سے واپس آگئے۔

• ـــ مولانا آزاد کی مصر میں ترکی کے انقلابیوں سے اور عراق میں ایران کے انقلابیوں سے ملاقات ہوئی ـ

• سنہ ۱۹۰۹ء میں مولانا آزاد کے والد کا انتقال ہوا

• ـــ سنہ ۱۹۱۲ء کے جون میں مولانا آزاد نے الہلال پریس قائم کیا اور الہلال کا پہلا پرچہ شائع کیا۔

• ـــ الہلال کی روش سے حکومت بوکھلا گئی اور پہلے اس سے ۲۰ ہزار کی ضمانت مانگی اور وہ ضبط کی پھر دس ہزار روپے کی ضمانت مانگی اور وہ بھی ضبط کرلی۔

• ـــ سنہ ۱۹۱۴ء میں الہلال بند ہوگیا

• ـــ سنہ ۱۹۱۵ء میں الہلال کا پریس بھی ضبط کرلیا گیا مگر ۵ ماہ ہی بعد مولانا نے البلاغ پریس کے نام سے دوسرا پریس قائم کر دیا۔

• ـــ سنہ ۱۹۱۶ء میں ۲۲ مارچ کو حکومت بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت کلکتہ سے ایک ہفتہ کے اندر نکل جانے کو کہا۔

• ـــ ۳۰ مارچ کو مولانا نے کلکتہ چھوڑا پنجاب، یو، پی، دلی اور بمبئی کی حکومتیں پہلے ہی مولانا کے داخلہ پر پابندی لگا چکی تھیں۔ مولانا رانچی چلے گئے جہاں چھ ماہ بعد رانچی میں انہیں نظر بند کر دیا گیا ـ

• ـــ سنہ ۱۹۱۹ء میں ۳۱ دسمبر تک مولانا رانچی میں نظر بند رہے ـ

• ـــ سنہ ۱۹۲۰ء میں یکم جنوری کو شاہی فرمان کے ذریعے دوسرے نظر بندوں کے ہمراہ مولانا کو آزادی ملی

• ـــ سنہ ۱۹۲۰ء کے جنوری میں مولانا آزاد کی دلی میں مہاتما گاندھی سے ملاقات ہوئی۔

• ـــ سنہ ۱۹۲۰ء میں ۲۰ جنوری کو خلافت کے مسئلہ پر دلی کے اجتماع میں شرکت کی۔

• ـــ خلافت کے مسئلہ پر وائسرائے کو پیش کی جانے والی یادداشت پر دستخط کئے ـ

• ـــ چند ہفتے بعد میرٹھ کانفرنس میں شرکت۔ گاندھی جی نے ترک موالات کا پروگرام پیش کیا۔ اور مولانا نے اس کی تائید کی۔ اس کے بعد دونوں نے ملک کا دورہ کرکے عوام کو اس پروگرام کیلئے تیار کیا

• ـــ ۲۹ فروری سنہ ۱۹۲۰ء کو کلکتہ خلافت کانفرنس کی صدارت کی ـ

• ـــ سنہ ۱۹۲۰ء میں ستمبر میں کلکتہ کے اسپیشل اجلاس کانگرس میں شرکت کی ـ

• ـــ سنہ ۱۹۲۰ء میں دسمبر میں ناگپور کے اجلاس کانگرس میں شرکت ـ

• ـــ سنہ ۱۹۲۱ء کے مارچ میں مولانا آزاد نے مہاتما گاندھی کے ہمراہ تیسرا سفر کیا ـ

• ـــ یکم جولائی سنہ ۱۹۲۱ء کو مولانا آزاد نے مرزا پور اسکوائر کلکتہ میں مسئلہ خلافت پنجاب اور آزادی وطن پر تقریر کی ـ

• ـــ ۱۵ جولائی کو اسی مقام پر ترک موالات پر تقریر کی۔

• ـــ دہلی میں مرکزی جمعیۃ علماء خلافت کمیٹی کے جلسوں میں کراچی ریزولیوشن پیش کیا آگرہ اور لاہور کی کانفرنسوں کی صدارت کی ـ

• ـــ ۳۰ ستمبر کو کراچی ریزولیوشن کی تائید میں اخبارات کو بیان دیا اور کہا کہ گورنمنٹ کو چاہئے تھا کہ علی برادران سے پہلے مجھ پر مقدمہ چلاتی اسلئے کہ یہ ریزولیوشن میں نے ہی تیار کیا تھا ـ

• ـــ نومبر میں جمعیۃ علماء کے اجلاس میں امام الہند مقرر کیا گیا ـ

• ـــ ۸ دسمبر کو اپنی گرفتاری کی باوثوق ذرائع سے اطلاع ملنے پر قوم کے نام ایک تحریری پیغام جاری کیا ـ

• ـــ ۱۰ دسمبر کو ۴½ بجے مولانا کو مسٹر گولڈی ڈپٹی انسپکٹر اسپیشل برانچ نے گرفتار کیا ـ

• ـــ ۱۳ دسمبر کو پہلی پیشی ہوئی ـ

• ـــ ۹ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کو مقدمہ کا فیصلہ سنایا گیا جس میں چیف پریزیڈنسی مجسٹریٹ نے ایک سال بامشقت کا حکم سنایا ـ

• ـــ سنہ ۱۹۲۳ء یکم جنوری کو جیل سے رہا ہوئے ـ

• ـــ ستمبر میں دلی میں کانگرس کے اسپیشل اجلاس کی صدارت کی ـ

• سنہ ۱۹۳۰ء میں نمک ستیہ گرہ شروع ہوئی جس میں صدر کانگرس کی گرفتاری کے بعد مولانا آزاد کانگرس کے صدر مقرر کئے گئے۔ اور انھوں نے اپنی گرفتاری سے پہلے ڈاکٹر انصاری کو صدر نامزد کیا ـ

• ـــ سنہ ۱۹۳۲ء میں گاندھی اروِن پیکٹ کے نتیجہ میں جیل سے رہائی ـ

• ـــ سنہ ۱۹۳۲ء میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی ناکامی کے بعد جیل میں سال بھر کے لئے نظر بندی۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں کانگرس کو نئے الیکشن میں حصہ لینے کا مشورہ دیا۔ پھر عہدے قبول کرنے کے لئے صلاح دی۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں کانگرس نے جو کانگرس پارلیمانی سب کمیٹی بنائی تھی اس میں مولانا آزاد کو، بنگال، بہار، یو، پی، پنجاب سندھ اور صوبہ سرحد کا نگراں بنایا گیا۔

سنہ ۱۹۴۰ء میں کانگرس کے صدر منتخب ہوئے اور رام گڑھ کے اجلاس کانگرس کی صدارت کی ـ

سنہ ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ کے اجلاس کے فوراً ہی بعد گرفتار کر لئے گئے اور دو سال کی سزا ہوئی ـ اور نینی جیل میں رہے

سنہ ۱۹۴۰ء اگست میں وائسرائے نے اپنی ایکزیکٹیو کونسل میں شامل کرنے کی بابت بات چیت کے لئے مدعو کیا ـ (باقی صفحہ ۳۰ پر)

نائب صدر جمہوریہ ہند کا پیغام

ایشیا کے آزاد ایڈیشن کیلئے پیغام ارسال کرتے ہوئے نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اپنے ۶ فروری سنہ ۱۹۶۱ء کے مکتوب گرامی میں لکھا ہے۔

محبی محترم!

آپ کے گرامی نامہ کا شکریہ!

ہر شخص کو جو مرحوم مولانا آزاد کی زندگی سے تحریک حاصل کرنا چاہے اس کی عالی ظرفی وسیع النظری اور وطنی خدمات اپنے خوبیاں ہیں جو انہیں ممتاز کرتی ہیں

آپ کا مخلص

(ایس۔ رادھا کرشنن)

عرب ایکا

بغداد میں عرب ممالک کے وزراء خارجہ کی کانفرنس گذشتہ ہفتہ ہوئی۔ جس میں گیارہ ممالک نے شرکت کی۔ عراق، متحدہ عرب جمہوریہ، اردن۔ لبنان۔ سعودی عربیہ۔ یمن۔ سوڈان۔ مراکو۔ ٹیونس۔ لیبیا۔ الجیریا اور دو غیر سرکاری نمائندے فلسطین اور عمان سے۔ اس کانفرنس میں وقت کے دو اہم مسائل پر غور کیا گیا۔ ایک الجزائر اور دوسرا فلسطین۔ الجزائر کی عارضی حکومت کے وزیر خارجہ نے نمائندوں کو بتایا۔ کہ الجزائر کی جنگ آزادی آخری مرحلوں پر ہے اب عرب ممالک کی (اخلاقی ہمدردی) کے علاوہ عملی ہمدردی کی اشد ضرورت ہے۔ عرب ممالک کو فرانس اور ناٹو طاقتوں سے سفارتی تعلقات توڑنے چاہئیں۔ فلسطین کا مسئلہ نازک صورت اختیار کر رہا ہے کیونکہ اطلاعات کے مطابق فرانس اسرائیل کو اسلحہ کی مدد کر رہا ہے۔ بغداد کے تمام ... اخبارات نے بھی اس موقع پر زور دیا کہ عرب ممالک کو اپنے معمولی اختلافات سے گزر کر زبانی ہمدردی کے علاوہ عملی قدم اٹھانے چاہئیں۔ اس احساس کے باوجود جو تجویز اس کانفرنس نے منظور کی ہے اس میں سوائے الفاظ کے ہیر پھیر کے کوئی عملی پہلو سامنے نہیں آیا۔ عرب ممالک کے سربراہوں کو جرأت اور دلیری سے کام لے کر الجزائر کے کشت و خون کو روکنے اور الجزائر کی مکمل آزادی کے لئے فرانس کے خلاف متحد ہونے کی ضرورت ہے۔ عرب عوام کے احساسات اس وقت اتحاد و اتفاق کے حامی ہیں۔ لیکن عرب حکومتوں کے سامنے اپنی اپنی مصلحتیں ہیں۔ جو متحدہ اقدام کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ دیکھئے اب انتظار ہے کہ

مردے غیب برون آید و کارے بکند

مہاراجہ بستر کی گرفتاری

مدھیہ پردیش سرکار نے مہاراجہ بستر کو گرفتار کر کے ہمت اور دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس لئے کہ یہ راجے مہاراجے اور نواب پرانے بوسیدہ نظام کو از سر نو زندہ کرنے کی سازشوں کا جال پھیلانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور عوامی جمہوری اداروں کے خلاف جاگیرداری کو زندہ کرنے کے خواب لے رہے تھے۔ جمہوریت اور آزادی کے نام پر کسی شخص کو سماج دشمن سرگرمیوں کی اجازت دینا یا اس کی کارگذاریوں پر چشم پوشی کرنا جمہوریت کو بدنام کرنا ہے۔

سوتنتر پارٹی کو مہاراجہ کی گرفتاری پر غصہ آیا ہے۔ لیکن یہ غصہ بے کار ہے جدید ہندوستان جس نے عوامی جمہوریت کو اپنایا ہے۔ خامیوں کے باوجود اس بات کے لئے تیار نہیں۔ کہ جاگیرداری نظام کو از سر نو زندہ کیا جائے۔ جو لوگ محض کانگرس کی دشمنی کی وجہ سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔ وہ عوامی جمہوریت کے دوست نہیں۔ یہ راجے مہاراجے اور نواب ملک میں انتشار پھیلانے والی طاقتوں کے سہارے اپنی ریاستوں کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کوششوں کو ناکامیاب بنانا ضروری ہے۔ راجے مہاراجے اور نوابوں میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ جنہوں نے وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا ہے اور نئی قدروں کو قبول کیا ہے یہ ان کی دور اندیشی اور سلیم فہم کی دلیل ہے۔

انجمن ترقی اردو کی بے عملی

انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجتماع کانپور میں ہوا۔ ملک کے مختلف حصوں سے تین سو ڈیلیگیٹ شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں جناب عبدالجبار صاحب (بمبئی) پروفیسر آنند موہن گلزار (دہلی) اور جناب غلام سرور صاحب (بہار) نے حق گوئی اور صاف بیانی سے کام لیا۔ اور انجمن کے عہدیداروں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے تیز سجاد پیش کئے۔ انجمن کے عہدیدار تساہل اور غفلت کی وجہ سے صوبائی سرکاروں کے اردو کے متعلق رویہ پر کڑی نگاہ نہیں رکھتے۔ ان حضرات کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کہ انجمن نے اس مطالبہ کو ایک تجویز کے ذریعہ دہرایا۔ کہ دہلی۔ یو۔ پی۔ اور بہار میں آئین کی دفعہ ۳۴۷ کے مطابق اردو کو علاقائی زبان قرار دیا جائے۔ انجمن نے اس بات پر بھی اظہار افسوس کیا۔ کہ مرکزی اور صوبائی سرکاروں نے جو اعلان کئے ان پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔

یہ بات قابل افسوس ہے کہ اردو کو اس کا مقام دینے سے گریز کیا جا رہا ہے اور اردو والوں کو صرف تھپکیاں دے کر طفل تسلی دی جا رہی ہے۔ حکومت کے سربراہ تقریروں کے ذریعہ بہت کچھ کہتے ہیں لیکن عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ انجمن ترقی اردو کو سرکاری گرانٹ ملتی ہے۔ لیکن عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں اردو کی درخواستوں پر غور نہیں ہوتا۔ ان کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا جاتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انجمن ترقی اردو اپنے کارکنوں کے ذریعہ ان درخواستوں کی فہرست شائع کرے۔ جو سرکاری افسر لینے سے انکار کرتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں عملی قدم اٹھائے۔ پارلیمنٹ کے ممبران کے ذریعہ بل پیش کرائے جائیں۔ اور آئینی جدوجہد کو تیز کیا جائے۔ صرف دبی زبان سے قصیدہ خوانی کر کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

محکمہ کسٹوڈین کی مہربانیاں

محکمہ کسٹوڈین کے ستائے ہوئے لوگوں کی پریشانیوں کا ابھی تک کوئی حل نہیں ہوا۔ ہمارے پاس متعدد شکایات اس قسم کی آتی رہتی ہیں۔ لوگوں کے مقدمات میں فیصلے ہو جانے کے باوجود ان کو دفتر کے چکر کٹوائے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے تنگ آ کر دفتر جانا چھوڑ دیا ہے۔ بعض ضعیف بوڑھے کمزور لوگ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تھک گئے۔ ایک کیس مثال کے طور پر ہم پیش کرتے ہیں:

۱۰ مارچ ۱۹۵۸ء کو ڈپٹی کسٹوڈین جنرل نے فیصلہ دیا۔ کہ فخر الدین غیر نکاسی ہے اور مکان نمبر ۲۵۵۰ بتا نمبر ۳۶۱۶ وارڈ نمبر ۱۲ میں ۱/۲ حصہ کا مالک ہے اس فیصلہ کے مطابق جائیداد کے فروخت کرنے سے جو رقم وصول ہوا اس کا ۱/۲ فخر الدین کو ملنا چاہیئے۔ متعدد درخواستیں دینے کے باوجود ابھی تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی ستمبر ۱۹۵۹ء میں ایک جواب دیا گیا تھا۔ جس میں یہ کہا گیا تھا۔ کہ معاملہ زیر غور ہے۔ عنقریب جواب دیا جائے گا۔ لیکن اس کو بھی ایک سال ہونے کو آیا۔ بوڑھے کی عمر ۷۰ سال سے زائد ہے۔ اس دھاندلی بازی کا شکار سینکڑوں غریب ہیں۔

ہم محکمہ بحالیات کے وزیر کی توجہ اس امر کی طرف دلانا چاہتے ہیں۔ جو لوگ غیر نکاسی قرار دیئے جا چکے ہیں۔ ان کے ساتھ یہ سلوک سراسر ناانصافی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں۔ کہ وہ محکمہ کو ہدایت جاری کریں گے کہ ہر حقدار کو اس کا حق ادا کر دیا جائے۔

کانگو کے سابق وزیر اعظم کا قتل

یہ ہے انسانی تہذیب و تمدن کا دور جس پر انسان کو فخر ہے اور وہ اپنی ترقی پر پھولا نہیں سماتا۔ حکومت نہیں بلکہ حکومتیں اس سازش میں شریک تھیں۔ کہ قتل سے پہلے فراری کی خبر اڑا دی جائے۔ اور بعد میں یہ اعلان کر دیا جائے۔ اس سازش نے امن کا ڈھول پیٹنے والوں کا پول کھول دیا۔ کٹانگا کی موجودہ حکومت خوش ہے۔ کہ ایک کانٹا تھا وہ نکل گیا لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ خوشی عارضی ہے۔ نسل انسانی کی تاریخ میں دشمنی کا مستقل بیج بو دیا گیا۔ اس کا نتیجہ عنقریب سامنے آ جائے گا۔ اقوام متحدہ اپنی بے بسی کا ماتم کر رہی ہے افریقہ کے اس ملک میں ڈرامے کا ایک کھیل ختم ہو گیا۔ اب نئی چال شروع ہو گئی۔ مغربی اقوام اپنا اقتدار چھوڑنے کے لئے تیار نہیں۔ اقتدار کی ہوس نے انسانی ضمیر کو بے جان اور مردہ بنا دیا ہے۔ انسان ترقی کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ لیکن انسانیت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اب دنیا کی بڑی قوموں کا امتحان ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بڑی قومیں سیاسی مصلحت کو مدنظر رکھ کر اس قسم کے واقعات پر زبان کھولتی ہیں۔ جہاں جہاں آزادی اور قومی جدوجہد چل رہی ہے۔ ایک یا دوسری بڑی قوم کا ہاتھ اس قسم کی کارگذاریوں میں ہے۔ الجزائر شنگری تبت اور اب کانگو میں یہ خونی ڈرامہ ہو رہا ہے لومبا کے قتل نے دنیا کے ضمیر کو جنبش دی ہے ان بڑی قوموں نے دنیا کے عوام کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ فریب کب ختم ہوتا ہے۔

مکانوں کی قلت

دہلی میں مکانوں کی قلت ہے اور ابھی یہ کچھ عرصہ جاری رہے گی۔ کیونکہ قیمتیں بڑھنے کی وجہ سے دہلی کے چیف کمشنر صاحب نے ۳۴ ہزار ایکڑ زمین کی خرید و فروخت بند کر دی۔ اس سلسلہ میں تجاویز مرکزی سرکار کے زیر غور ہیں کہ وہ اس زمین کو کس طرح ہاؤسنگ کو آپریٹو سوسائٹیوں اور صنعتی ضرورتوں کے لئے دے۔ ان تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چیف کمشنر صاحب کو اختیارات دیئے جائیں گے کہ وہ اس کی تقسیم کریں۔

ہماری رائے میں یہ فیصلہ جلد ہونا چاہیئے اور چیف کمشنر صاحب کے اختیارات میں اضافہ کیا جائے تاکہ ہر چھوٹی چھوٹی بات کے لئے بار بار معاملہ مرکزی محکموں میں نہ جائے جس طرح دوکانوں کے بند کرنے اور کھولنے کے اوقات کی تبدیلی کا حق چیف کمشنر صاحب کو دے دیا گیا ہے اسی طرح ان زمینوں کی الاٹمنٹ کا کام ان کے سپرد کیا جائے تاکہ ہاؤسنگ کو آپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ مکان بنائے جا سکیں دفتری کارروائیوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اصل مسئلہ کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کرایہ خور لوگوں کے لئے زمینوں کی الاٹمنٹ بند کر کے صرف نجی رہائش کے مکان کو آپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعہ بنائے جائیں ان کے نقشے بنا کر دے دیئے جائیں۔ تاکہ لوگ ان نقشوں کے مطابق اپنے مکانات کی تعمیر کریں۔

چین کے ہمدرد آنکھ کھولیں

چین کی جارحیت کے باوجود کمیونسٹ اور کمیونسٹ نواز عنصر چین سے ہمدردی کا دم بھرتے ہیں۔ اور چین کے دعووں کی حمایت کرتے ہیں۔

جناب امن لکھنوی

جامع کمالات۔ آزاد

جب ایک ذات میں بہت سی خوبیاں جمع ہوں تو یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی کون کون سی خوبی سب سے نمایاں ہے۔ مولانا عالم زیادہ بڑے تھے یا سیاستداں۔ ان میں قوت تقریر زیادہ زبردست تھی یا قوت تحریر۔ ان میں ذکاوت زیادہ تھی یا حافظہ۔ ان میں قوت برداشت زیادہ تھی یا برجستگی۔ ان میں تنظیم زیادہ تھی یا تدبیر۔ مزاج میں سنجیدگی زیادہ تھی یا لطافت۔ اس کا اندازہ وہی شخص کرسکتا ہے جس میں ان خوبیوں کو سمجھنے کی پوری پوری صلاحیت ہو۔ میرے لئے یہ موازنہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے ـــ ان الفاظ کے ساتھ مولانا آزاد کی 'جامع کمالات' شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے اردو کے مشہور شاعر اور ادیب جناب گوپی ناتھ امن۔ چیرمین پبلک ریلیشنز کمیٹی دلی۔ ایڈمنسٹریشن نے مولانا آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کا سب سے زیادہ مخالفانہ اثر مسلمانوں پر پڑا اس کے بعد مدتوں انتشار کا عالم رہا ایک طرف مسلمانوں میں شکست خوردگی کا احساس پیدا ہوا۔ دوسری طرف ہندوستان کی حکومت براہ راست ملکۂ انگلستان کے ہاتھوں میں آگئی۔ تاجروں کی حکومت ختم ہوگئی۔ ہندوؤں کے ایک طبقہ نے اس تبدیلی سے بہت فائدہ اٹھایا۔ مسلمانوں میں دو طبقۂ خیال پیدا ہو گئے۔ ایک وہ جو علماء کے زیر اثر تھے۔ دوسرے وہ جن کی رہنمائی سرسید احمد خاں کر رہے تھے جن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اب انگریزوں کی حکومت کا ہٹانا مشکل ہے اس لئے ان سے مل کر چلنا چاہئے۔ علماء چاہتے تھے کہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد جاری رہے مگر یہ راستہ کٹھن تھا، خطرناک تھا۔ مصیبتوں سے پر تھا۔

سرسید نے جو راہ دکھائی وہ عافیت کی تھی، امان کی تھی۔ غدر کے تیس سال بعد تک یہی کیفیت رہی لیکن ۱۸۸۷ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس کو قائم ہوئے دو سال ہوئے تھے لارڈ لٹن وائسرائے ہند اس کی طرف سے کھٹکے اور انھوں نے یہ سوچا کہ وفادار مسلمانوں کی رہنمائی کی جائے۔ چنانچہ ۱۸۹۳ء میں پہلے پہل مسلمانوں کی طرف سے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ ہوا۔ لارڈ کرزن نے اسے اور ہوا دی اور ۱۹۰۶ء میں جب سرسید احمد خاں بھی نہیں رہے تھے اور لارڈ کرزن کی جگہ لارڈ منٹو وائسرائے ہوکر ہندوستان آگئے تھے۔ سر آغا خاں کی صدارت میں جو وفد ان سے ملا یا یہ کہئے کہ انھوں نے خود ملنے کو بلایا انھوں نے واضح طور پر جداگانہ نیابت کا مطالبہ کیا، اور ۱۹۰۹ء مارلے منٹو اصلاحات میں اس کی بنیاد پڑ گئی۔ اور ان اصلاحات نے ۱۹۱۹ء میں [مستقل] شکل صورت اختیار کر لی۔ ہرچند لارڈ مارلے اس کے خلاف تھے مگر لارڈ منٹو کے استعفی کی دھمکی کے سامنے ان کا کوئی بس نہ چلا اور انہیں بھی دستخط کرتے ہی بنی۔

اس منزل پر مولانا ابوالکلام آزاد سیاست ہند میں داخل ہوتے ہیں اور ان کا ہفتہ وار "الہلال" مسلمانوں کو ایک نئی راہ دکھاتا ہے۔ علماء ہرچند قربانی میں پیش پیش تھے مگر نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ سرسید نے جو راہ دکھائی تھی اس نے مسلمانوں کو انگریزوں کی گود میں ڈال دیا تھا۔ مولانا نے مسلمانوں کو بیداری کا سبق دیا۔ ساتھ ہی انھیں تعمیری راہیں دکھائیں مولانا کے دل میں طاقت تھی، قلم میں زور تھا الفاظ پر عبور رکھتا۔ علم کا خزانہ تھا ہمت بے پایاں تھی اور کیا چاہئے جنگ طرابلس نے اور بھی مسلمانوں میں بے چینی پیدا کی۔ "الہلال" اس بے چینی کی بجلی سے روشنی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ انگریز اس سے کھٹکے ادھر جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ علی برادران بھی نظر بند ہو گئے اور مولانا آزاد بھی۔ الہلال بند ہو گیا۔ مولانا کے کتنے ہی مسودے جو در اصل ان کے جگر پارے تھے پولیس نے دوران تلاشی یا اس کے بعد ضائع کر دیئے۔ مولانا آزاد پر پہلے مختلف صوبوں میں داخلہ کی ممانعت کے احکام تعمیل کئے گئے، اور بعد کو انہیں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا جہاں سے وہ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد رہا ہوئے اس رہائی کے بعد ہی میں نے ۱۹۲۰ء میں مولانا کی پہلی تقریر لکھنؤ کے رفاہ عام ہال میں سنی تھی جس کا موضوع تھا۔

"سوراج کیا ہے"

اگرچہ میں ۱۹۱۴ء سے مختلف لیڈروں کی تقریریں سنتا رہا تھا اور ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کانگرس کے اجلاس میں تو بہتوں کو سنا تھا لیکن اس پایہ کی تقریر اب تک کبھی نہ سنی تھی۔

سب سے کم عمر میں کانگرس کی صدارت کرنے کا فخر مولانا ہی کو حاصل ہوا۔ یعنی ۱۹۲۳ء میں جب انہوں نے دلی میں کانگرس کے اجلاس کی صدارت کی اس وقت ان کی عمر کل ۳۵ سال کی تھی۔ چالیس سال سے کم عمر میں کسی اور نے کانگرس کی صدارت نہیں کی۔ مولانا ہی کی صدارت میں سوراج پارٹی اور گاندھی وادیوں کا سمجھوتہ ہوا تھا جس کا امکان بہت کم نظر آرہا تھا۔

مولانا نے دوسری بار کانگرس کی صدارت ۱۹۴۰ء میں کی۔ یہ بھی بڑا نازک موقع تھا سبھاش بابو اور ان کے ساتھی کانگرس سے الگ ہو چکے تھے اور کانگرس کے اندر انتشار کی صورت پیدا ہو چلی تھی لیکن انفرادی ستیہ گرہ کی جو تحریک مولانا آزاد کے دور صدارت میں چلی اس نے انتشار کے اس بڑھتے ہوئے عمل کو روک دیا اور ۱۹۴۲ء کی تحریک نے تو ہندوستان کو آزادی دلا دی۔ یہ دونوں تحریکیں مولانا ہی کے دور صدارت میں چلیں۔

انڈین نیشنل کانگرس کے بہت سے صدر گزرے ہیں لیکن کسی کو یہ فخر نہیں حاصل ہوا کہ اس نے مسلسل چھ سال تک صدارت کی ہو اگرچہ اس مدت میں سے چار سال انھیں جیل خانے میں گزرے۔ مولانا کی زندگی کے دس سال قید و نظر بندی کی حالت میں گزرے۔

جب ایک ذات میں بہت سی خوبیاں جمع ہوں تو یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ اس کی کون سی خوبی [...] نمایاں ہے۔ [...] عالم زیادہ بڑے تھے یا سیاست داں، ان میں قوت تقریر زیادہ زبردست تھی یا قوت تحریر، ان میں ذکاوت زیادہ تھی یا حافظہ۔ ان میں قوت برداشت زیادہ تھی یا برجستگی۔ ان میں تنظیم زیادہ تھی یا تدبیر۔ مزاج میں سنجیدگی زیادہ تھی یا لطافت۔ اس کا اندازہ وہی شخص کرسکتا ہے جس میں ان خوبیوں کے سمجھنے کی پوری صلاحیت ہو۔ میرے لئے یہ موازنہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ جب ان کی تقریر سنی تو وہ سب سے بڑے خطیب نظر آئے جب ان کی تحریریں پڑھیں تو وہ صف اول کے صاحب طرز ادیب معلوم ہوئے جب ترجمان القرآن پڑھا تو ایسا معلوم ہوا کہ انھوں نے تمام مذاہب کا عطر کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ جب کانگرس کی کارروائیوں میں ان کا حصہ دیکھتا ہوں تو یہ نظر آتا ہے کہ خود مہاتما گاندھی ان سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اور مہاتما جی کے انتقال کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کو یہ کہنا پڑا کہ اب میں کس سے مشورہ کروں گا۔

جب غبار خاطر دیکھتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی میں مولانا آزاد کے پایہ کا خط لکھنے والا بھی کوئی نہیں گزرا۔ جب سیاسی دنیا میں مولانا آزاد کی قوت برداشت پر نظر جاتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں صبر ایوب موجود تھا۔ ان کی ذکاوت دیکھ کر مہاتما گاندھی کو بھی کہنا پڑا کہ ان سے زیادہ عقلمند آدمی میں نے نہیں دیکھا ہے اور حافظہ تو اس بلا کا پایا تھا کہ جیل میں بیٹھے بیٹھے جہاں ان کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی یا بہت قلیل تعداد تھی بے تکلفی سے سینکڑوں حوالے دیدیئے۔ مولانا کے طنز و مزاح میں جو سنجیدگی شان ہے وہ ان کا اپنا حصہ ہے۔ اگر کسی سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے تو غالب سے۔ برداشت کا اعلیٰ ترین پہلو یہ ہے کہ انھوں نے کسی کو برا نہیں کہا یعنی انھیں بھی نہیں جو دن رات انہیں برا کہتے رہتے تھے۔ مولانا کی طبیعت کی نفاست اور لطافت دیکھکر یہ حیرت معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے سیاست کے خشک میدان میں اپنی عمر کا طویل حصہ کیسے گذارا جہاں "افراد گنے جاتے ہیں تولے نہیں جاتے"

وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا نے ملک کو جو کچھ فائدہ پہنچایا ہے اس کا صحیح اندازہ اس عبوری دور کے ختم ہونے کے بعد کیا جاسکے گا بہر حال میں تو فارسی شاعر کے لفظوں میں یہی کہہ سکتا ہوں ؎

زفرق تابہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

گوپی ناتھ امن

مہد سے لحد تک

سوانح حیات

محمد محی الدین ابو الکلام آزاد

نام و پیدائش

مولانا ابوالکلام آزاد ستمبر ۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ کی مقدس سرزمین میں محلہ قدوۃ متصل باب السلام میں پیدا ہوئے۔ نام احمد رکھا گیا۔ محی الدین عرفیت ہے والد نے تاریخی نام فیروز بخت رکھا اور مصرعہ ذیل سے تاریخ پیدائش سنہ ہجری کے مطابق نکالی:۔

جوان بخت و جوان طالع جوان باد
۱۳۰۵ھ

ابوالکلام کنیت ہے اور آزاد قلمی نام ہے اور مولانا آزاد نے خود تذکرہ میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔ . . . .

یہ غریب الدیار عہد و نا آشنائے عصر۔ بیگانۂ خویش و نمک پروردہ ریش معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس ہستی نمایش وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم۔

حسب و نسب

مولانا کا تعلق دلی کے ایک ایسے خاندان سے ہے جو علم و دین کا سرچشمہ اور مرکز فیضان

رہا ہے۔ اور سلسلہ شیخ جمال الدین افغانی تک پہنچتا ہے جو عام طور سے شیخ بہلول دہلوی کے نام سے مشہور ہیں۔

آپ کے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہو گئے ہیں اور تینوں ہی خاندان علم و فضل کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ اس لئے مولانا کا خاندانی سلسلہ حسب و نسب دونوں اعتبار سے ایسا ہے جو علمائے دین اور بزرگان ملت کا خاندان ہے۔ اس لئے مولانا کو قدرتاً جو عزت اور بزرگی ملی ہے وہ انہیں ورثہ میں بھی ملی تھی۔

آپ کے والد مولانا خیر الدین ایک بہت بڑے عالم دین تھے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد آپ کو ترک وطن کرنا پڑا سا ور اکبر کے دور میں جو کچھ شیخ جمال الدین افغانی پر بیتی تھی۔ وہی ۱۸۵۷ء میں مولانا خیر الدین پر گزری۔

مولانا خیر الدین کے والد کا انتقال ان کے بچپن ہی میں ہو گیا تھا اس لئے ان کی پرورش ان کے (مولانا خیر الدین کے) نانا مولانا منور الدین نے کی۔ غدر سے دو برس پہلے مولانا منور الدین نے مکہ معظمہ ہجرت کر جانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس ارادے سے روانہ ہوئے۔ وہ بھوپال پہنچے تو نواب سکندر جہاں بیگم بھوپال نے انہیں نظر بند کر دیا۔ اسی دوران میں غدر شروع ہو گیا اس لئے وہاں دو سال تک رہے۔ پھر وہاں سے چل کر بمبئی پہنچے تو دست اجل نے ان کے قدم تھام لئے۔ مولانا خیر الدین کی عمر اس وقت

پچیس برس کی تھی وہ مکہ معظمہ چلے گئے۔ اور وہاں رہنے لگے۔

قیام مکہ کے دوران مفتی مدینہ شیخ محمد بن ظاہر وتری کی دختر سے شادی کی جو گزشتہ دور کے اکثر علماء حجاز کے استاذ حدیث اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکہ معظمہ کے آخری محدث تھے۔ مولانا کے دادا مولانا محمد ہادی عہد شاہجہاں میں قلعہ آگرہ کے گورنر تھے اور مولانا کے والد کے نانا مولانا منور الدین عہد مغلیہ کے آخری رکن المدرسین مولانا نے مورث اعلیٰ علامہ جمال الدین افغانی جو شیخ بہلول دہلوی کے نام سے موسوم ہیں عہد اکبر کے بہت بڑے عالم دین تھے اور اکبر اعظم کو بھی ان کے علم و فضل کا اعتراف تھا۔ لیکن جب اکبر نے دین الٰہی جاری کیا تو علامہ جمال الدین افغانی نے اس فتوے پر دستخط کرنے سے انکار کیا۔ جس میں اکبر کو دین الٰہی کا بانی تسلیم کیا گیا تھا جس پر ان کے خلاف سازشوں کا ایک جال بچھایا گیا اور علامہ جمال الدین افغانی ہجرت کر کے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔

مولانا کے والد مولانا خیر الدین جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ایک بہت بڑے عالم دین تھے ان کی کتابیں ترکی کے خلیفہ سلطان عبدالحمید نے اپنے خرچ سے مصر میں چھپوائی تھیں۔ سلطان نے ان کی علمی شہرت سن کر انہیں ترکی بلا لیا تھا۔ مولانا خیر الدین ایک بہت بڑے پیر بھی تھے اور ان کے لاکھوں

مرید تھے۔ آپ نے اپنے مریدوں سے جو گجرات کاٹھیاواڑ، بمبئی اور کلکتہ میں بکثرت پھیلے ہوئے تھے تقریباً دس گیارہ لاکھ روپے جمع کر کے مکہ معظمہ کی مشہور نہر زبیدہ کی مرمت کرائی تھی۔

مولانا خیر الدین نے اپنے قیام مکہ کے دوران ہی شادی کی۔ آپ کی اہلیہ (مولانا آزاد کی والدہ محترمہ) مدینہ منورہ کے مفتی اور بہت بڑے عالم دین شیخ محمد بن ظاہر وتری کی دختر تھیں شیخ وتری گزشتہ دور کے اکثر علمائے حجاز کے استاذ حدیث اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکہ معظمہ کے آخری محدث تھے۔ ان کے بعد اس درجہ کا کوئی شیخ حدیث حرمین میں پیدا نہیں ہوا۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی عزت و عظمت اور علم و فضل کے اعتبار سے جو درجہ ہے وہ اپنی جگہ ہے اور سچ یہ ہے کہ مولانا نے اپنے بزرگوں کا نام روشن کیا ہے اور ان کی عزت و عظمت اپنے بزرگوں کی وجہ سے قائم نہیں ہوئی لیکن یہ چونکہ ایک رسم دنیا ہے اس لئے اس کا بیان ہوا۔ ورنہ مولانا آزاد کی رائے تو اس سلسلے میں یہ ہے کہ خاندان کے فخر کا بت بھی عہد جاہلیت کی ایک یادگار مشئوم ہے اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اس کو بھی توڑ دیا تھا۔

تعلیم اور ابتدائی حالات

مولانا نے تعلیم گھر پر ہی پائی اور اس زمانے کے رواج کے مطابق عربی فارسی اردو پڑھی اور درس نظامی کا پورا کورس چار برس میں مکمل کر لیا۔ بعد کو انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا تو ایک ابتدائی کتاب پڑھنے کے بعد انجیل کے اردو فارسی ترجمہ کی مدد سے انگریزی کی انجیل پڑھ کر انگریزی کی قابلیت پیدا کی اس طرح مولانا آزاد نے باقاعدہ کسی مدرسے یا مکتب کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی۔

مولانا کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور بارہ چودہ برس کی عمر میں اخبارات و رسائل میں مضامین شائع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ پندرہ برس کی عمر تھی جب آپ نے لسان الصدق کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ نکالا۔ اس زمانے میں مولانا نے خواجہ الطاف حسین حالی کی

(باقی صفحہ ...)

---

۱ تذکرہ مولانا آزاد کی سب سے پہلی تصنیف ہے جس میں انھوں نے اپنے بزرگوں کا تذکرہ قلمبند کیا ہے اور اس میں اپنے ابتدائی حالات بھی لکھے ہیں۔

مولانا آزاد کی کمی ہندوستان ہر موقع پر محسوس کریگا

(سفیر سعودی عرب شیخ یوسف الفوزان)

مملکت سعودیہ عربیہ کے شاہی سفیر ہز ایکسیلنسی شیخ یوسف الفوزان نے "ایشیا" کے آزاد ایڈیشن، کیلئے پیغام ارسال کرتے ہوئے مدیر ایشیا میر مشتاق احمد کے نام مکتوب گرامی میں لکھا . . . . !

جناب مکرم - السلام علیکم -

مجھے یہ سنکر بے حد خوشی ہوئی کہ آپ مولانا آزاد (مرحوم) کی تیسری برسی کے موقع پر اپنے موقر جریدہ "ایشیا" کا خاص نمبر شائع کر رہے ہیں۔

مولانا آزاد کے متعلق اتنا کچھ کہا اور لکھا گیا ہے کہ اب کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی سوائے اس کے کہ وہ ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ ایسی شخصیت جو اپنی جگہ منفرد تھی۔ جہاں تک سیاست ہند کا تعلق تھا مولانا آزاد کی کمی ہندوستان ہر موقع اور اقدام پر محسوس کرتا رہیگا۔ اور جہاں تک ادب ان کی ذات سے متعلق تھی اردو زبان ان کی یاد میں ہمیشہ ماتم گسار رہے گی۔

آپ کی پرخلوص ذات سے امید ہے کہ آپ مولانا آزاد جیسی شخصیت کے ساتھ پورا پورا انصاف کرینگے اور آپ کا یہ خاص نمبر اس ذات کے شایان شان ہوگا۔

اپنی تمام تر نیک خواہشات کے ساتھ —

مخلص کیش
(یوسف الفوزان)

(سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست)

ابوالسیاست مولانا آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد کے اردو زبان اور ہندوستان کی سیاست پر بہت بڑے احسانات ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا آسرا تھے۔ مگر آپ نے اپنی وزارت کے زمانے میں مصنفین شعراء اور اخبار نویسوں کی ماہواری لٹریری پنشن مقرر کرنے کا جو قانون پاس کرایا اور اب ایک سو کے قریب اہل قلم سرکاری خزانہ سے پنشن لے رہے ہیں یہ ہندوستان کی تمام زبانوں اور لٹریچر پر بہت بڑا احسان ہے۔

مرحوم مولانا آزاد کا نام ابوالکلام تھا اور دنیا بھی ان کو ابوالکلام (قادر الکلام) قرار دیتی ہے۔ کیونکہ آپ نے اردو زبان میں نئی راہیں پیدا کیں۔ پر میری رائے میں آپ ابوالکلام سے زیادہ ابوالسیاست کہلانے کے مستحق ہیں۔ کیونکہ آپ کے سیاسی میدان میں آنے سے پہلے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان انگریزوں کی وفا شعاری کو اپنے مذہبی شعار کا ایک حصہ قرار دیتے تھے اور صرف آپ کی ذات ہی تھی جس نے مسلمانوں میں سب سے پہلے عملی طور پر غیر ملکی حکومت کے خلاف جھنڈا بلند کیا۔ اور "الہلال" و "البلاغ" کے ذریعے ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر سیاسی خودداری کی بنیادیں قائم کیں۔ چنانچہ "الہلال" اور "البلاغ" ہندوستانی مسلمانوں اور سیاسی خیالات کے حلقوں میں کس قدر مقبول اخبارات تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں کلکتہ کی ڈاک لاہور میں شام کے وقت پہنچتی یہ ڈاک سورج غروب ہونے کے وقت پبلک میں تقسیم کی جاتی اور لوگ آپ کے اخبار "الہلال" یا "البلاغ" کو چراغوں کی روشنی میں پڑھتے اور بغیر پڑھے سو نہ سکتے تھے۔

بہت برس ہوئے "ریاست" کے عروج کے زمانے میں مجھ سے ایک شخص نے سوال کیا تھا کہ میں جرنلزم کے اعتبار سے کس کا شاگرد ہوں تو میں نے جو جواب دیا اور اس کا اخبار ریاست میں اقرار کیا وہ یہ تھا کہ

"میں مولانا ابوالکلام کا شاگرد ہوں حالانکہ مجھے کبھی مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا اور نہ مرحوم سے کبھی خط و کتابت ہوئی۔ بلکہ فی الحقیقت پوزیشن یہ تھی کہ "الہلال" اور "البلاغ" کی فائلوں کے بار بار پڑھنے کے باعث میرا ذہن ان جذبات سے متاثر ہوا جن جذبات کا "الہلال" اور "البلاغ" میں اظہار کیا جاتا رہا۔ اور جسے انقلاب پسندانہ جرنلزم قرار دیا جا سکتا ہے اور میرا ہی کیا سوال ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبارات "الہلال" اور "البلاغ" نے سینکڑوں نہیں ہزارہا مضمون نویس جرنلسٹ ادیب اور اہل قلم پیدا کئے۔

مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد خاندانی اعتبار سے بہت خوش حال تھے اور آپ کے والد کے صرف کلکتہ میں ہی ہزارہا مرید تھے مگر خود مولانا اپنی فیاضی فطرت کے باعث اکثر تنگدست رہتے۔ چنانچہ آپ کے ساتھ سالہا سال تک کام کرنے والے مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے مجھے بتایا کہ کلکتہ میں ہی آپ کئی کئی روز تک بغیر گھی کے دال اور چاول کھا کر گزارہ کر لیا کرتے اور جب آپ کے پاس روپیہ ہوتا تو بغیر کسی تکلف کے ضرورت مندوں کو دے دیتے۔ چنانچہ راقم الحروف کو اچھی طرح سے یاد ہے کہ یکم جنوری ۱۹۵۲ء کی صبح کو جب میں آپ سے ملا تو آپ کے قریب ہی تپائی پر آپ کی چیک بک رکھی تھی جو اس بات کا ثبوت تھا کہ جب آپ کسی کو روپیہ دینا چاہتے ہیں تو اپنے بکس میں سے چیک بک کو نکالنے کی بھی دیر نہیں کرتے اور آپ کے پرائیویٹ سکریٹری محمد اجمل خاں صاحب نے مجھے بتایا کہ جب آپ کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی موٹر کی آٹھ اقساط باقی تھیں جو ابھی موٹر کمپنی کو ادا نہ ہوئی تھیں یعنی روپے کے جمع ہونے کا کیا سوال ہے مرحوم نے مقروض حالت میں انتقال کیا۔

مولانا ابوالکلام کی یادداشت کے سینکڑوں قصے مشہور ہیں کسی شخص کو صرف ایک بار دیکھ لیتے تو پچیس پچیس برس کے بعد بھی وہ شخص ملتا تو بتا دیتے کہ فلاں جگہ، فلاں سال میں دیکھا تھا۔ چنانچہ راقم الحروف حیران رہ گیا جب آپ نے فرمایا کہ آپ کو مجھے ایک ہوٹل میں ایکبار دیکھا تھا۔ حالانکہ اس وقت کوئی بات نہ ہوئی اور نہ تعارف تھا۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ دہلی کے شیکاف ہوس کے قریب سول ملٹری ہوٹل کے نام سے ایک کشمیری پنڈت (جو غالباً سر کیلاش نرائن ہکسر کے بھائی کے داماد تھے) کا ایک انگریزی اسٹائیل کا ہوٹل تھا میں وہاں کھانا کھانے اکثر جایا کرتا ایک روز وہاں گیا اور ایک کیبن میں کھانا کھانے کے لئے داخل ہوا۔ تو وہاں مولانا تشریف فرما تھے میں مولانا کو دیکھتے ہی "معاف کیجئے" کہہ کر واپس آ گیا اور کھانا کھانے کے لئے دوسرے کیبن میں چلا گیا یعنی میں مولانا کے سامنے چند سیکنڈ سے زیادہ نہ رہا مگر سالہا سال کے بعد آپ نے بتایا کہ فلاں ہوٹل میں آپ نے مجھے دیکھا تھا۔

مولانا آزاد غیر معمولی بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ غیر ضروری طور پر خوددار تھے بغیر کام کے نہ کسی کے ہاں جاتے اور نہ کسی کو بغیر کام کے آنے کے لئے کہتے۔ مرکزی گورنمنٹ کے وزراء کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ مولانا ان کے ہاں کھانے پر نہیں آتے، اور جب کبھی کوئی شخص آپ کو ملاقات کے لئے جاتا اور آپ کو یہ معلوم ہوتا کہ ملنے والے کو کوئی کام نہیں اور صرف کورنش کرنا چاہتا ہے یا صرف نیاز حاصل کرنے والوں میں سے ہے تو کوشش ہوتی کہ بغیر کسی کام کی ملاقات میں وقت ضائع نہ ہو۔ چنانچہ مجھے یاد ہے ایک روزنامہ اردو اخبار کے ایڈیٹر صاحب آپ کی ملاقات کے لئے آپ کی کوٹھی پر گئے۔ مولانا صاحب نے اپنے سکریٹری اجمل خاں کی معرفت دریافت کیا کہ کیا کام ہے ایڈیٹر صاحب نے فرمایا کوئی کام نہیں صرف نیاز حاصل کرنا ہے یہ سن کر مولانا نے اجمل خاں سے ٹال دینے کو کہا۔ ایڈیٹر صاحب غصہ کی حالت میں واپس آئے اور آپ نے اپنے اخبار میں مولانا کے خلاف ایک طویل ایڈیٹوریل لکھا اور اس ایڈیٹوریل میں مولانا پر مغرور اور متکبر ہونے کا الزام لگایا گیا۔ چنانچہ اس ایڈیٹوریل کو دیکھ کر "ریاست" میں ایک نوٹ شائع کیا گیا جس میں اس روزنامہ اردو اخبار کے ایڈیٹر صاحب سے درخواست کی گئی کہ مولانا کی خودداری کو غرور اور تکبر قرار نہ دیجئے۔ دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ کورنش کرنا پسند کرتے ہیں اور نہ کورنش دینا۔ ان دونوں سے الگ رہتے ہیں اور مولانا کی خودداری کی تو بڑے سے بڑے حلقوں نے بھی اس وقت داد دی جب انھوں نے دیکھا کہ آپ کو پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے گوڑگانوں کے حلقہ سے کھڑا کیا تو آپ وہاں ایک بار لوگوں سے ووٹ کا مطالبہ کرنے نہ گئے اور لوگ آپ کو دیکھنے کو ترستے ہی رہے حالانکہ دوسرے امیدوار صبح سے شام تک ووٹروں کے دروازوں کی خاک چھانتے اور ہاتھ باندھ باندھ کر التجائیں کرتے۔

مولانا مرحوم میں مہمان نوازی کی بھی بہت بڑی صفت موجود تھی اور عارضی مہمانوں کے علاوہ مستقل مہمان بھی کئی کئی ماہ یا کئی کئی سال تک آپ کی کوٹھی میں قیام کرتے اور اس سلسلے میں مسٹر ہمایوں کبیر ڈاکٹر سید محمود اور مسٹر آصف علی وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں جو کئی کئی ماہ تک آپ کے ہاں بطور مہمان مقیم رہے۔ اور نہ صرف آپ کی پیشانی پر کبھی بل نہ آیا بلکہ مہمانوں کا قیام آپ نے اپنے بلند اخلاق کے باعث خدائی رحمت قرار دیا۔

مولانا ابوالکلام کی صاف بیانی کے متعلق بھی بہت سی روایتیں موجود ہیں تیاولہ آبادی کے زمانے میں مسٹر انیس احمد عباسی ایڈیٹر "حقیقت" لکھنؤ کے داماد آپ کے پاس مشورہ کرنے گئے۔ جو ہندوستان کی فوج میں کیپٹن تھے اور آپ نے مولانا سے پوچھا کہ آپ ہندوستان میں ہی رہیں یا اپنی ملازمت پاکستان کو منتقل کرا لیں مولانا نے تمام حالات سننے کے بعد فرمایا۔

میرے بھائی حالات بدل چکے ہیں اگر آپ ہندوستان میں ہی رہے تو میجر کے عہدے سے آگے نہ جا سکیں گے اگر پاکستان چلے گئے تو وہاں سی آپ کی ترقی کے بہت سے راستے موجود ہیں اب آپ سوچ لیجئے کہ آپ کو کیا کرنا چاہیئے۔

مولانا کی یہ رائے سن کر کپتان صاحب پاکستان چلے گئے اور اب وہاں فوج میں بہت بڑے عہدے پر ہیں۔ مولانا کی صاف بیانی کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ دلچسپ ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی جب ہندوستان سے پاکستان جانے والے تھے تو آپ مولانا سے ملنے گئے اور بتایا کہ آپ ہمیشہ کے لئے پاکستان جا رہے ہیں۔ مولانا نے اس تبدیلی کا سبب پوچھا تو جوش صاحب نے کہا میری اولاد کا مستقبل یہاں تاریک ہے اس لئے میں پاکستان جانا چاہتا ہوں، یہاں میری اولاد اردو زبان سے محروم ہو جائے گی اس پر مولانا نے فرمایا۔ (باقی صفحہ ۳۸ پر)

(جناب رام لال ودھوا ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز دہلی اسٹیٹ)

"وہ اپنی ذات سے یک انجمن تھے!"

بیسویں صدی ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھی جائے گی۔ صرف اس لئے نہیں کہ اس صدی کے وسط میں ہم آزادیٔ وطن سے ہم آغوش ہو گئے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اس صدی نے ہمارے ملک کی سرزمین سے ایسے مشاہیر پیدا کئے ہیں۔ جن کا نام رہتی دنیا تک روشن رہے گا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یہ کلیہ (انسانوں) پر بھی عائد ہوتا ہے۔ ہر ملک اور ہر دور میں ضرورت کے مطابق مشاہیر پیدا ہوتے ہیں۔ جو رہنمائی کر کے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔ انیسویں صدی میں ہماری آزادی کی جدوجہد کا سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ اس جدوجہد کی رہنمائی کرنے والے بھی خود بخود نمودار ہوئے اور انہوں نے وہی اندازِ عمل اختیار کیا۔ جو وقت کے تقاضے کے مطابق تھا۔ بیسویں صدی کی دوسری سہ ماہی میں مہاتما گاندھی منظرِ عام پر آئے۔ اور انہوں نے مجاہدینِ آزادی کا رُخ اہنسا یا عدم تشدد کی طرف پھیر دیا۔ ایسے نوجوانوں کے لئے یہ سخت آزمائش کا وقت تھا جن کی رگوں میں تشدد وار انقلاب کا خون موجزن تھا۔ مولانا آزاد بھی اوائل عمر میں ایسے ہی نوجوانوں میں سے ایک تھے۔ مگر شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ اوّل سے آخر تک وہ اپنے ہمعصروں میں سب سے مختلف اور کئی اعتبار سے سب سے ممتاز تھے۔

اس گہرائی میں جانے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے کہ مولانا آزاد نے عدم تشدد کو کس شکل میں اور کس وجہ قبول کیا۔ اس قسم کا سوال تو ہمارے بہت سے رہنمایانِ وطن کے

مولانا آزاد فطرتاً آزاد تھے۔ وہ اس درجہ آزاد خیال اور آزاد رو تھے کہ شاید وہ کسی کے پیرو اور مقلد نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ آزادیٔ ملک کی جدوجہد میں پیش پیش رہنے والی ایک جماعت کی رہنمائی کا بار اٹھا سکے۔ اور وہ بھی ایسے دور میں جب یہ جدوجہد فیصلہ کن مرحلہ سے گذری۔ یہ اُن کے ضبط و نظم کی بین دلیل ہے۔ آزاد خیال اور آزاد روی رہبری کا بنیادی وصف ہے۔ یہ سرشت میں ودیعت تھا

بارے میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اتنی بات صاف ہے کہ ایک مرتبہ عدم تشدد کا اصول قبول کر لینے کے بعد آخر تک وہ اس کے پابند رہے گو بجائے خود یہ بات بہت معمولی معلوم ہوتی ہے مولانا آزاد کے سلسلہ میں اس کی اہمیت بہت غیر معمولی ہے اس لئے کہ جو دل اور دماغ ابتدا سے تشدد آمیز انقلابی سانچے میں ڈھلا ہو۔ وہ انقلابی جوش قائم رکھتے ہوئے امن و آشتی کی راہ قبول کرے اور اس پر قائم رہے یہ بڑی مشکل بات ہے۔

مولانا آزاد فطرتاً آزاد تھے۔ وہ اس درجہ آزاد خیال اور آزاد رو تھے کہ شاید وہ کسی کے پیرو اور مقلد نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ آزادی ملک کی جدوجہد میں پیش پیش رہنے والی ایک جماعت کی رہنمائی کا بار اٹھا سکے اور وہ بھی ایسے دور میں جب یہ جدوجہد فیصلہ کن مرحلے سے گزری۔ یہ ان کے ضبط و نظم کی بین دلیل ہے۔

آزاد خیالی اور آزاد روی رہبری کا بنیادی وصف ہے۔ یہ وصف مولانا آزاد کی سرشت میں ودیعت تھا۔ ۱۹۱۶ء میں جب مہاتما گاندھی نے جنوبی افریقہ سے واپسی پر پہلی جنگِ عظیم میں انگریز سرکار کی امداد کا پیمان اور اعلان کیا تھا۔ تو مولانا آزاد نے اپنی آواز جنگ ملوکیت کے خلاف بلند کی تھی۔ اس وقت وہ صرف ستائیس اٹھائیس سال کے نوجوان تھے۔ اس دلیرانہ آزاد روی کی پاداش میں انہیں نظر بند کر دیا گیا۔ جب ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے تو مہاتما گاندھی انگریز سرکار کے خلاف عدم تعاون کا پرچم بلند کر رہے تھے یا کرنے والے تھے۔

جدوجہد آزادی اور بعد کے سیاستدانوں کے فکر و عمل کی تحقیق کرنے والے کسی کے متعلق خواہ کسی نتیجہ پر پہنچیں۔ مگر وہ یہ ضرور فتوےٰ دیں گے کہ مولانا آزاد ان معدودے چند رہنماؤں اور مدبروں میں سے تھے۔ جن کے ذہن نے دو قوموں کے وجود کی دلیل کی بناپر ملک کی تقسیم کا اصول کبھی قبول نہیں کیا۔ ہاں تاریخ اور تقدیر کے ہاتھوں نے جو نقش کر دیا۔ اُسے ناگزیر سمجھ کر وہ چار و ناچار خاموش ہو گئے۔ اور پھر آزاد ہندوستان کی تعمیر نو میں اپنے رفقائے کار کے مدد و معاون ہوئے۔

مولانا آزاد کی سیاسی فہم و ذکاء کا ... مثال ثبوت اُس وقت سامنے آیا۔ جب انہوں نے ۱۹۴۲ء میں پرطانوی حکومت سے سمجھوتے کی وہ شرطیں نامنظور کر دیں۔ جو کرپس مشن سے منسوب تھیں حالانکہ خاصی قوی رائے سمجھوتے کے حق میں تھی۔ ایک بڑی جماعت کا رکن ہو کر اپنی آزاد خیالی برقرار رکھنا اور بے خوفی سے رہنمائی کرنا انتہائی مشکل ہے۔ مولانا آزاد سے کمتر درجہ کے انسانوں سے یہ قریب قریب ناممکن ہے۔

مشاہیر کی عظمت کی پیمائش کرنا ممکن نہیں دو بڑی ہستیوں کا مقابلہ یا موازنہ کرنا بھی آسان نہیں۔ اس قسم کی کوشش کرنا مناسب بھی نہیں۔ ہر بلند شخصیت اپنی انفرادیت رکھتی ہے۔ مگر یہ عرض کرنا بے موقعہ نہ ہوگا کہ مولانا آزاد بہت بلند اور روشن انفرادیت کے مالک تھے۔

لیکن جو بات مولانا آزاد کو ان کے معاصرین سے یک قلم ممتاز کرتی ہے وہ اُن کی شخصیت کی جامعیت اور ہمہ گیری تھی۔ اُن کے قریب جا کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک پہاڑ کی بلندی سے دوچار ہیں۔ علم و ادب۔ ہنر و فن۔ صحافت تاریخ۔ فلسفہ۔ منطق۔ نفسیات۔ دینیات۔ غرضیکہ زندگی کا کوئی پہلو، در فکر و نظر کا کوئی شعبہ ہو۔ مولانا آزاد سے گفتگو کر کے فیض حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ان کا دماغ بیش بہا معلومات کا گنجینہ تھا۔

کسی گتھی کو سمجھنے و سلجھانے میں مولانا آزاد کو دیر نہیں لگتی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ جن فریقوں سے معاملہ متعلق ہو وہ متذبذب ہیں۔ سیاسی میدان میں ذاتی طور پر مجھے ایک مرتبہ اُن کے حضور میں ایک فریق کی حیثیت سے پیش ہونیکا موقعہ ہوا۔ فی الحال میں اس کا تفصیلی ذکر کرنے سے معذور ہوں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں۔ کہ جو مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا۔ بہت طولانی تھا۔ اور سیاست میں ہر گتھی آسانی سے پیچیدہ بن جاتی ہے مگر مولانا صاحب نے چند منٹ کی گفتگو میں فیصلہ صادر فرما دیا۔ اور تاکید بھی کر دی۔ کہ آئندہ اس موضوع پر آمد اس نوعیت کا تنازعہ یا مقدمہ پیش کرنے کی نوبت نہ آئے۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ سیاسیات میں فکر و نظر کو فیصلہ کن مرکز پر رکھنا نہ صرف غیر معمولی فہم و فراست بلکہ غیر معمولی جرأت کا کام ہے مولانا آزاد کو یہ غیر معمولی توفیق بدرجہ غائت حاصل تھی۔

سب جانتے ہیں کہ مہاتما گاندھی کو اظہار خیال پر مآل کا صعود تھا وہ بہت ناپ تول

جو بات مولانا آزاد کو ان کے معاصرین سے یک قلم ممتاز کرتی ہے وہ اُن کی شخصیت کی جامعیت اور ہمہ گیری تھی۔ اُنکے قریب جا کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک پہاڑ کی بلندی سے دوچار ہیں۔ سیاست و تدبر علم و ادب۔ ہنر و فن۔ صحافت تاریخ فلسفہ منطق نفسیات۔ دینیات غرضیکہ زندگی کا کوئی پہلو اور فکر و نظر کا کوئی شعبہ ہو مولانا سے گفتگو کر کے فیض حاصل کیا جا سکتا تھا اُن کا دماغ بیش بہا معلومات کا گنجینہ تھا

کر رائے دیتے تھے۔ نکتہ چینی کی طرح تائید و تعریف کرتے وقت بھی بیحد اعتدال اور توازن سے کام لیتے تھے۔ مہادیو ڈیسائی نے ۱۹۴۰ء میں جب کہ مولانا آزاد دوسری مرتبہ (پہلی بار ۱۹۲۳ء میں) کانگرس کے صدر منتخب ہوئے۔ ان کے متعلق ایک مختصر کتاب لکھی۔ اس پر گاندھی جی کا چند سطری پیش لفظ یوں مرقوم ہے

"مجھے ۱۹۲۰ء سے مولانا آزاد کے ساتھ رہ کر قومی کام کرنے کا فخر حاصل ہے اسلام کے عبور میں ان کی برابری کوئی نہیں کر سکتا۔ وہ عربی کے جید عالم ہیں۔ اُن کی قوم پرستی اتنی ہی نمایاں ہے جتنی کہ اسلام سے اُن کی عقیدت۔ وہ آج انڈین نیشنل کانگرس کے روحِ رواں ہیں اس کے گہرے معانی ہیں جو سیاسیات ہند کے کسی بھی طالب علم کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے"

۱۹۳۰ء کے بعد ہمارا قومی قافلہ تین منزلوں سے گزرا۔ انگریز سے ساتھ ذاتی ملک کے متعلق گفت و شنید، حصولِ آزادی اور تقسیم ملک۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی بھی منزل میں جو بے حد دشوار بلکہ پُرخار تھی۔ مولانا آزاد کے پائے عزم و استقلال میں لغزش نہیں آئی۔

رہی تعمیر و ترقی کی منزل جس سے کاروانِ ہند ہنوز گزر رہا ہے تو یہ کوئی ہمارے محبوب وزیر اعظم اور اُن کے ہمرکاب رہنمایانِ وطن سے پوچھے کہ وہ مولانا کی مفارقت سے اپنے درمیان آج کس قدر خلا محسوس کرتے ہیں۔

جناب محمد اجمل خاں صاحب نے جنہیں مولانا آزاد سے بہت قرب حاصل تھا۔ مولانا صاحب کے مکاتیب کے مجموعہ موسومہ غبارِ خاطر کی تمہید میں جو کچھ رقم فرمایا ہے اس کی چند سطریں ذیل میں نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ مولانائے محترم کی جامع زندگی کو اس سے بہتر انداز میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ اضافہ کر دینا مناسب ہے کہ اجمل صاحب نے مولانا صاحب کی حیات میں جو خیالات قلمبند کئے تھے ان کی واقعیت اب

(باقی صد ۲۳ پر)

مولانا ابوالکلام آزاد

جناب بسمل سعیدی

کم ہوا کرتے ہیں اس دُنیا میں وہ مردانِ کار
زندگی اور موت دونوں کو ہو جن سے افتخار
زندگی اپنے محاسن خود بیاں کرتی نہیں
موت کرتی ہے محاسن زندگی کے آشکار
زندگی رکھتی ہے آغوشِ بقا میں کچھ نفس
موت کرتی ہے حیاتِ جاوداں سے ہمکنار
جب سماتی ہے یہ بڑھ کر وسعتوں میں موت کی
آب جوئے زندگی بنتی ہے بحرِ بیکنار
ثبت ہو جاتا ہے لوحِ دہر پر اس کا دوام
موت کر دیتی ہے جس کی زندگی کو استوار
زندگی جس سمت جب چاہے بدل سکتی ہے رُخ
موت ہی پر منحصر ہے زندگی کا اعتبار
اپنے زشت و خوب میں ہوتی ہے ساری زندگی
موت کے اک لمحۂ آخر کے زیرِ اختیار
زندگی ہے موت کے تابع مگر با ایں ہمہ
موت کا بھی ایک وضعِ زندگی پر ہے مدار
زندگی بھر کے خیالوں ہی کا ہے اک خواب موت
موت خود بھی زندگی کی ہوتی ہے آئینہ دار
بالعموم انساں کو موت آتی ہے حسبِ زندگی
ہے یہی کچھ فطرتِ عادل کا دستور و شعار
الفراق اے منزلت یابندۂ مرگ و حیات
موت کے راس البضاعت زندگی کے شاہکار
تیری مرگ و زلیست دو حلقے ہیں اک زنجیر کے
سلسلہ کردار کا تیرے ہے شل کوہسار
تھا اسی کا مقتضیٰ تیرا عمل آغاز سے
زندگی جس موت پر منتج ہوئی پایانِ کار
ماتمِ انسانیت کرنے کو تیری موت پر
آج شاید آسماں پر ہوں ملائک سوگوار

سلسلہ جن کی فضیلت کا ہے تاخیر القرون
چند اُن اسلاف کا تھا آخری تو یادگار
موج اندر موج تھا اک قُلزمِ زخّارِ فہم
علم کا تو ایک عالم تھا دیار اندر دیار
تھا ترے فتراک میں ماضی تو اک صیدِ زبوں
تھی تری فکرِ قدر انداز [illegible] تقبل شکار
ما کدر تھا رو تڑا اور ما صفا [illegible] را قبول
نہی و امرِ دینِ برحق تیرا ترک وا [illegible] یار
در کفے جامِ شریعت در کفے سندانِ عشق
تو مشیرِ عقل تھا اور تو جنوں کا مستشار
تیرے ہی نقشِ قدم پر پڑتے ہیں سب کے قدم
کس قدر روندی ہے تو نے عظمتوں کی رہگزار
دیکھ کر اندازِ تیری روح کے روزِ ازل
دی حیاتِ دنیوی تجھ کو ابد نے مستعار
بر بنائے پختگیٔ عقل [illegible] ری زندگی
اپنے ایک اک سانس میں رکھتی ہے قرنوں کا شمار
ہو سکا تجھ تک پہنچ کر مفتخر دورِ جہاں
ہو سکے گا اور کیا فوزِ عظا [illegible] م روزگار
تھا ترے آغازِ عظمت ہی کا پرچم الہلال
تھی تری صبحِ نخستیں رُو کشِ نصف النہار
کس قدر ویران ہے مستقبلِ النابغہ [illegible]!
عالمِ تخلیق میں ہے اک خلائے بیکنار
ہو سکے گی کیا تلافی اب غمِ مافات کی
چشمِ ہستی حشر تک شاید رہے گی اشکبار
تھی تری وضعِ تواضع میں سرافرازی کی شان
تیری اُفتادِ طبیعت میں ہمالہ کا وقار
پیش پا اُفتادہ رہتی تھی بہ صد عجز و نیاز
کج کلاہی سے تری شانِ کلاہِ تاج [illegible] ار

ناطقہ تیری طلاقت پر اگر قرباں تھا
تھی طلاقت تیرے اندازِ خطابت پر نثار
اس طرح مُنہ سے ترے جھڑتے تھے پھول الفاظ کے
خُلد سے جیسے بہاروں کا گرے اک آبشار
جنبشِ ادنیٰ تھی تیرے کلک کی اعلیٰ ادب
غازۂ رُوئے نگارش تیری خاطر کا غبار
نامۂ اعمال در دست آئیں گے جس وقت لوگ
حشر میں تو آئے گا تفسیرِ قرآں در کنار
ناموافق جس قدر ہوتی سیاست کی فضا
ہمتِ عالی کو ہوتی اتنی ہی کچھ سازگار
قلعۂ احمد نگر کو یاد ہیں وہ صبح و شام
تھی جہاں شامِ خزاں تیرے لئے صبحِ بہار
تھا ترے نزدیک عینِ وقتِ آزادیٔ ہند
عہدِ افرنگی کا دورِ قید و بند و گیر و دار
ہاں پریشاں کُن تری جمعیتِ خاطر کو تھا
مسلمِ ہندوستاں کا افتراق و انتشار
تو امیرِ کارواں بھی تھا امام الہ [illegible] ر بھی
ماسوائے ملک، ملت کا بھی تھا تو ذمہ دار
منتہائے عزم تیرا اس سے ظاہر ہے کہ تھی
ہمرہوں کی منزلِ مقصود تیری رہگذار
تھا جہانتابِ فضا [illegible] تیرا خورشیدِ حیات
اب حیات افروزِ عظمت ہے تری شمعِ مزار
سر بر افلاک اس زمیں کو کر گئی کس کی نظر
زیرِ پائے مسجدِ جامع بنا کر یہ مزار
مسجدِ جامع! تری رفعت کا ضامن ہو گیا
علم و دیں کا اک ستوں، عزم و عمل کا اک منار
سر بہ سجدہ ہے وہ تیری سیڑھیوں کے سامنے
تیری محرابوں میں بھی ایسے نہیں طاعت گزار

اُس کے ذمے تھے جو تیرے حق وہ پُورے کر گیا
اب ترے ذمے ہے اُس پر رح [illegible] پروردگار

ثبت ہے عظمت پہ تیری مہرِ توثیقِ دوام!
یہ عظی [illegible] المرتبت تربت، فلک رفعت مزار

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن (عثمانی)

مولانا آزاد کے آئینہ کردار کا ایک خاص جوہر

اب سے ۴۵ سال قبل ۱۹۱۵ء میں سب سے پہلے مولانا آزاد مرحوم کو دارالعلوم دیوبند کی ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ یہ تقریب اس وقت کے لیفٹیننٹ گورنر لارڈ مسٹن کی آمد پر منائی گئی تھی۔ تقریب کے انتظامات اعلیٰ پیمانے پر کئے گئے تھے۔ نواب چھتاری حافظ احمد سعید خاں صاحب اور ان کے خاندان کے دوسرے نواب مہینوں پہلے انتظامات کے لئے آ گئے تھے۔ دارالعلوم کو دلہن کی طرح سجایا گیا تھا یہ ایک تاریخی اجتماع تھا۔ اس اجتماع میں حکیم محمد اجمل خاں، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کو بھی دعوت شرکت دی گئی۔ مگر عین وقت پر کچھ ایسی صورت پیش آئی کہ حکیم صاحب اور مولانا محمد علی تو اجلاس میں شریک ہوئے لیکن حکام کی مصلحت نے مولانا آزاد کی شرکت گوارا نہیں کی۔

دارالعلوم کے اندرونی احاطے میں پُر رونق اجلاس ہو رہا تھا اور مولانا آزاد لائبریری ہال میں ٹہل رہے تھے۔ وہ وقت بھی عجیب تھا، میری آنکھوں میں آج تک وہ نقشہ گھوم رہا ہے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہٗ تو بالقصد جلسہ میں شریک نہیں ہوئے تھے اور مولانا آزاد کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا مولانا دارالعلوم کے کتب خانے سے حضرت کے مکان پر تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر وہیں قیام کیا اور دہلی واپس آ گئے۔ حضرت شیخ الہند رحمہ مولانا آزاد کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تشریف بھی لے گئے تھے۔ "الہلال" و "البلاغ" کے ہنگامہ خیز جذبہ آفریں اور سحر کار مقالات کی وجہ سے مولانا پہلے ہی دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے اس واقعہ کے بعد سے ان کی عظمت کی چھاپ اور بھی پختہ ہو گئی۔ اس کے بعد جمعیۃ علماء ہند کے اجتماعات کی تقریب سے مرحوم سے بارہا کسب فیض کا موقع ملا۔ اور ان کی پر عظمت زندگی کی انفرادیت کے عجیب عجیب گوشے سامنے آئے۔ حسن اتفاق سے ۳۲ء سے ۱۹۳۴ء کے آخر تک میرا قیام کلکتہ میں ہو گیا۔ ان دنوں میں مرحوم سے طویل اور بے تکلفی کی ملاقاتیں ہر جلسہ ان سے قریب ہونے کا موقع ... ان کی عظمت ... مرحوم ... کلام کی فصاحت

و بلاغت، خطابت کی ساحری، علم و دانش فہم و تدبر، فکر و نظر کی وسعت، مجتہدانہ علم و فضل، فداکارانہ خدمات اور ایثار و قربانی کی روایات پر بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں اور لکھے جائیں گے کیونکہ ایسی جامع اور ہمہ گیر شخصیتیں کم ہی دیکھی گئی ہیں۔ مگر انسان کے جس کمال کے سامنے فرشتے قدسیوں ہوتے ہیں وہ ان تمام کمالات سے بلند و بالا کر مجھ پر مولانا کے اسی کمال کا غیر معمولی اثر تھا۔ یعنی یہ کہ ان کو اپنے دل و دماغ، زبان اور جذبات پر ایسی قدرت حاصل تھی جس کی مثال کہیں اور نظر نہیں آئی۔

مسلم لیگ کے طوفانی دور میں مولانا کے سیاسی حریفوں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا ایک ایسا شخص جو اٹھتی جوانی ہی میں قوم کی آنکھ کا تارا بن چکا تھا اور جس کے سامنے مدرسوں اور یونیورسٹیوں کے بڑے بڑے علماء و فضلا عقیدت کی گردن جھکایا کرتے تھے بیرطیلے میں "شو بوائے" کے لقب کا مستحق ہو گیا تھا اور نونہالان قوم نے اپنی آنکھ کے اسی تارے پر پتھروں اور جوتوں کی بارش کی تھی، مگر سب جانتے ہیں کہ قوم کے اس بے رحمانہ سلوک کے باوجود مولانا کی پیشانی پر نہ صرف یہ کہ غیظ و غضب کی ایک شکن بھی نہیں پڑی بلکہ کبھی تنہائی میں بھی اپنے کسی بڑے سے بڑے مخالف کا شرائی کے ذکر نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے مولانا کے کمال کی اس خصوصیت کو الفاظ کے قالب میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اب میں ان سطروں کو جو مولانا اور ان کے کمالات کے لئے لکھی گئی ہیں ان ہی کے مضمون کے اقتباس پر ختم کرتا ہوں۔

"غبار خاطر" میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں حسب معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا ؎

کر لذتم و قیمتم افزوں ز شمار است
گوئی ثمر پیشتر از باغ وجودم

غور فرمائیے کیا عمدہ مثال دی ہے۔ اپنے اکثر بے فصل کے میوے کھائے ہوں گے مثلاً جاڑوں میں آم چونکہ بے فصل کی چیز ہوتی ہے نایاب اور تحفہ سمجھی جاتی ہے۔ لوگ بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدتے ہیں ... لیکن جو ... لذت ... کی ... اور گرانی ... وہی

بے لذتی کی بھی ہو گی، کھائیے تو مزا نہیں ملتا اور مزہ ملے تو کیسے ملے؟ جو موسم ابھی نہیں آیا اس کا میوہ ناوقت پیدا ہو گیا۔ یہ زمین کی غلط اندیشی تھی کہ وقت کی پابندی بھول گئی اور اس غلط اندیشی کی پاداش ضروری ہے کہ میوے کے حصہ میں آئے۔ تاہم چونکہ چیز کمیاب ہوتی ہے اس لئے بے مزہ ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتی، کھانے والوں کو مزہ نہیں ملتا پھر بھی زیادہ سے زیادہ قیمت دے کر خریدیں گے یہ جنس نایاب جتنی بھی گراں ہو ارزاں ہے۔

غور کیجئے تو انسان کے افکار و اعمال کی دنیا کا بھی یہی حال ہے یہاں صرف موسم کے درخت ہی نہیں اُگتے موسم کے دماغ بھی پھولا کرتے ہیں اور پھر جس طرح کا یہاں ہر فضائی موسم اپنے مزاج کی ایک خاص نوعیت رکھتا ہے اور اسی کے مطابق اسکی تمام پیداوار ظہور میں آتی رہتی ہیں اسی طرح وقت کا ہر دماغی موسم بھی اپنا ایک خاص معنوی مزاج رکھتا ہے اور ضروری ہے کہ اسی کے مطابق طبیعتیں اور ذہنیتیں ظہور میں آئیں۔ لیکن چونکہ یہاں فطرت کی یکسانیوں اور ہم آہنگیوں کی طرح اس کی گاہ گاہ کی ناہمواریاں بھی ہوتی ہیں اور یہاں کا کوئی قانون اپنے فلتات اور خوارق سے خالی نہیں اس لئے کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ ناوقت کے پھلوں کی طرح ناوقت کی طبیعتیں ظہور میں آ جاتی ہیں اسے کارخانہ نشو و نما کے کاروبار کا نقص کہئے یا زمانے کی غلط اندیشی وقت لیکن بہرحال ایسا ہونا ضرور ہے، ایسی ناوقت کی طبیعتیں جب کبھی ظہور میں آئیں گی تو ناوقت کے پھلوں کی طرح موسم کے لئے اجنبی ہوں گی نہ تو وہ وقت کا ساتھ دے سکیں گی۔ نہ وقت ان کے ساتھ میل کھا سکے گا تاہم چونکہ ان کے نمود میں ایک طرح کی غرابت ہوتی ہے اس لئے ناوقت کی چیز ہونے پر بھی بے قدر نہیں ہو جاتیں لوگوں کو مزہ ملے یا نہ ملے لیکن ان کی گراں قیمتی کا اعتراف ضرور کریں گے۔

شاعر کی وقت تخیل نے اسی صورتحال کا سراغ لگایا اور دو مصرعوں میں ایک بڑی کہانی سنا دی۔

یہ شعر دہراتے ہوئے مجھے خیال ہوا میرا اور زمانہ کا باہمی معاملہ بھی شاید کچھ ایسی ہی نوعیت کا ہوا ... کی بے میل وقت اور فکر و عمل کے کسی گوشے میں بھی وقت اور موسم کے پیچھے چل دیکھی سے وجود کا نقص کہئے۔ لیکن یہ ایک ایسا نقص تھا جو اول روز سے طبیعت اپنے ساتھ لائی تھی اور اس لئے وقت کی کوئی خارجی تاثیر اسے بدل نہیں سکتی تھی۔ زمانہ جو قدرتی طور پر موسمی چیزوں کا دلدادہ ہوتا ہے اس ناوقت کے پھل میں کیا لذت پا سکتا تھا؟ لوگ کھاتے ہیں تو مزہ نہیں ملتا۔ تاہم اس بے مزگی پر بھی اپنی قیمت ہمیشہ گراں ہی رہی لوگ جانتے ہیں کہ مزہ ملے نہ ملے مگر یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی ع

متاع من کہ نصیبش مباد ارزانی!

مولانا آزاد کی زندگی ایک نظر میں

(بقیہ صفحہ ۴۳)

۱۹۲۱ء دسمبر میں رہائی عمل میں آئی۔

فروری ۱۹۴۲ء میں جنرل چیانگ کائی شیک سے ہندوستان کے مطالبۂ آزادی پر گفتگو۔

مارچ اور اپریل ۱۹۴۲ء میں کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے اسٹیفورڈ کرپس سے بات چیت۔ جو ۱۰ اپریل کو ناکامی پر ختم ہو گئی۔

۳ اگست کو کلکتہ سے بمبئی کے لئے روانگی اور آئی سی سی کی میٹنگ میں شرکت کی۔

۷ اگست کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارت کی جس میں ہندوستان چھوڑ دو کا ریزولیوشن منظور ہوا۔ دوسرے دن دوسرے ممبران ورکنگ کمیٹی کے ہمراہ بمبئی میں گرفتاری۔

۱۹۴۳ء میں بیگم آزاد کا انتقال۔

۱۹۴۵ء میں رہائی اور شملہ کانفرنس میں شرکت

۱۹۴۶ء میں برطانوی وزارتی مشن سے مذاکرات میں حصہ لیا اور مجلس دستور ساز کے رکن منتخب ہوئے

۱۹۴۷ء میں عبوری حکومت میں شرکت آزادی کے بعد وزیر تعلیم بنے۔

۱۹۵۱ء میں کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر چنے گئے۔

۱۹۵۲ء کے عام انتخابات میں رامپور کے حلقے سے پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے

۱۹۵۵ء میں یورپی اور مغربی ایشیاء کے ممالک کا دو ماہ کا دورہ خیرسگالی کیا۔

۱۹۵۶ء میں یونسکو کے نویں اجلاس کی دلی میں صدارت کی۔

۱۹۵۷ء کے عام انتخابات میں گوڑگاؤں سے پارلیمنٹ کے لئے ممبر منتخب ہوئے۔

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؁

از جناب سید شہید الدین

سوانح آزاد — آزاد کی تحریروں میں

"سیلاب آتا ہے تو اس کی سطح پر سر بفلک عمارتیں حباب کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ زلزلہ آتا ہے۔ تو غریبوں کی جھونپڑیوں کے ساتھ قصر شاہی کے ستون بھی متزلزل ہو جاتے ہیں۔ آندھی چلتی ہے۔ تو سب سے پہلے عظیم الشان محلوں کے کنگورے ہی اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی وہی پانی جو طوفان بن کر موجیں مارتا تھا۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ابر کرم کا چھینٹا بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی زمین کی وہی حرکت جو زلزلہ بن جاتی ہے۔ ایسا بھی انقلاب ہوتا ہے۔ کہ سبزہ کی لہک اور بوئے گل کی موج ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا وہی تند جھونکا جو آندھی بن کر چلتا تھا۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ نسیم خوش گوار بن کر چلنے لگا ہے"

(ابوالکلام آزاد)

مولانا محی الدین احمد المعروف بہ مولانا ابوالکلام آزاد نومبر ۱۸۸۸ء میں بمقام معلقہ متصل باب السلام پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب عہد اکبری کے مشہور صوفی بزرگ اور عالم دین حضرت مولانا جمال الدین سے ملتا ہے۔ اور ملک کے طول و عرض میں آپ کے والد معتقدین ہزاروں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تھے۔ ۱۸۵۷ء سے انگریزی استبداد اور ظلم و لوٹ کھسوٹ سے تنگ آکر آپ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اور مکۂ معظمہ میں جاکر پناہ لی۔ مولانا آزاد نے خود ان کے حالات قلمبند فرماتے ہوئے لکھا ہے:۔

"میرے والد مولانا خیر الدین ۱۸۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ والدین کا صغر سنی ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے نانا کے یہاں پرورش ہوئی۔ یہ زمانہ دلی کا ایسا زمانہ تھا کہ قدیم اسلامی حکومت نے آخری سنبھالا لیا تھا۔ اس لئے ہر علم و فن کے اچھے اچھے لوگ جمع تھے۔ اور ان کی (والد کی) زندگی جو کچھ معلوم ہوا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں اپنی تعلیم و تربیت اور نشوونما کے لئے ایسا وسط میسر آیا تھا جو تھوڑے دنوں بعد ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔"

مقیم مکہ کے حالات واضح کرتے ہوئے ایک جگہ مولانا نے لکھا ہے:۔

"جب اُن کے نانا نے ہجرت کا ارادہ کیا۔ تو یہ بھی اُن کے ساتھ روانہ ہوئے بھوپال میں بھی آپ ساتھ ہی مقیم رہے اور وہاں سے مکہ معظمہ گئے یہاں مولانا محمد یعقوب اس وقت زندہ تھے اُن سے مسند حدیث کی تجدید کی۔ اور اس طرح شاہ صاحب کا سلسلہ ایک واسطے کی کمی سے حاصل ہو گیا"

ہندوستان چھوڑنے اور عزم ہجرت کے ساتھ مکہ کا سفر اختیار کرنے کی وجوہات ظاہر کرتے ہوئے مولانا سے روایت ہے:۔

"غدر سے پہلے علمائے دہلی کا یہ حال تھا۔ کہ ہندوستان کی حالت اور بربادیاں دیکھ کر عموماً یہاں کے قیام سے برگشتہ خاطر ہو گئے تھے۔ اور ایک ایک کر کے یہاں سے روانہ ہونے لگے تھے۔ عام طور پر ہر سال بڑی بڑی جماعتیں جایا کرتی تھیں جو قافلہ کے نام سے مشہور تھیں"

مولانا خیر الدین بھی یہاں کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر عازم ہجرت ہوئے۔ مدینہ کے مفتی اکبر شیخ محمد ظاہر نے اُن کے ساتھ وجہ خصوصیت اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ کر آخر بیٹی سے ان کا عقد کر دیا۔ اور انہیں کے بطن سے مولانا آزاد تولد ہوئے۔ عمر کے ابتدائی چند سال مکہ ہی میں بسر کئے۔ اور ابتدائی تعلیم کا آغاز بھی یہیں ہوا۔

مولانا خیر الدین مرحوم کے معتقدین اور مریدین کا ایک بڑا سلسلہ تمام ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بمبئی۔ کاٹھیاوار۔ گجرات۔ سیلون۔ حتیٰ کہ افریقہ تک میں اُن کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔

قیام مکہ ہی میں انہوں نے (مولانا خیر الدین نے) وہاں کے مفتی اکبر کی بھانجی سے نکاح کر لینے کے بعد اُن کے اصرار کے بموجب مستقل سکونت مکہ میں ہی اختیار کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہاں کے دستور کے مطابق اس وقت کوئی شخص سرزمین حجاز پر اپنی جائداد منقولہ یا غیر منقولہ نہیں رکھ سکتا تھا۔ جب تک کہ وہ شریف مکہ کی رعایا ہونے کا جواز نہ حاصل کرے۔ چنانچہ مولانا خیر الدین نے مکہ کی رعیت ہونا قبول کر کے وہیں ایک مختصر سا قطعہ زمین خرید کر اپنا ایک ذاتی مکان بنا لیا۔ جو محلہ قدوہ متصل دارالسلام میں واقع تھا۔ اور اس طرح ہندوستان کی واپسی کا خیال ترک کر دیا۔

لیکن اچانک ایک ایسا حادثہ پیش آگیا۔ کہ انہیں مجبوراً ہندوستان کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ ہوا یہ کہ اسی عرصہ میں ان کے پاؤں کی ہڈی کسی وجہ سے گر جانے کے باعث ٹوٹ گئی۔ اور اس وقت چونکہ مکہ میں ڈاکٹری علاج کا کوئی معقول بندوبست نہیں تھا۔ اور جس ڈاکٹر نے ان کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑا تھا۔ ٹھیک طور پر نہ جڑنے کے باعث اس میں اور زیادہ تکلیف پیدا ہو گئی۔ چنانچہ علاج کے لئے انہیں مجبوراً ہندوستان آنا پڑا۔ یہاں علاج سے فائدہ ہو گیا۔ لیکن معمولی سی لنگ آخر تک باقی رہ گئی۔ ہندوستان آنے پر ان کے مریدین اور معتقدین کے حلقے نے اس طرح انہیں گھیرا۔ کہ دوبارہ واپس مکہ جانے کی کوئی کشش ہی نہ رہی۔ اور انہیں مجبوراً کلکتہ میں قیام کرنا پڑا۔ اسی سال ایک بڑا حادثہ یہ ہوا کہ ان کی اہلیہ محترمہ (مولانا آزاد کی والدہ) انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔ اس سانحہ کا اُن کے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا۔ کہ انہوں نے دوبارہ مکہ کا قصد کیا۔ لیکن بعض علائق ایسے تھے۔ کہ یہاں سے واپسی ناممکن نہ ہو سکی۔

مولانا خیر الدین مرحوم جیسا کہ ابھی بتایا گیا ہے اپنے وقت کے جید عالم، جلیل القدر بزرگ اور صوفی صافی تھے۔ اور ساتھ ہی مشرقی اور خالص اسلامی تہذیب کے سرتاپا مرقع۔ انہیں کے زیر تربیت مولانا کی تعلیم و پرورش۔ ساخت و پرداخت اور ذہنی نشوونما ہوئی تھی۔ ظاہر ہے۔ کہ ایک ایسا شخص جو قدیم اسلامی تہذیب و تمدن اور جاگیردارانہ مذہبی ماحول کا مخصوص ترین نمائندہ ہو۔ اس کی نگرانی میں تعلیم و تربیت کا طریقہ اور سسٹم کیا رہا ہوگا۔ مولانا آزاد کو بچپن ہی سے عربی و فارسی کی مذہبی تعلیم دی گئی تھی۔ اور سختی کے ساتھ اس بات کا بندوبست کیا گیا تھا۔ کہ مغربی تہذیب کی اُبھرتی ہوئی کرنوں کی طرف اُن کی نظر نہ جا سکے۔ چنانچہ زمانۂ تعلیم میں انہیں انگریزی علوم کی طرف دھیان دینے کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ بات اور ہے۔ کہ اپنی استعداد اور ذہانت کے طفیل انہوں نے بعد کو انگریزی علوم و فنون سے گہری واقفیت حاصل کر لی تھی۔

اپنی تعلیم و تربیت کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے:۔

"والد کو ہماری تعلیم کے بارے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ ایک طرف تو ان کو علمائے وقت سے عام طور پر مذہبی سوئے اعتقاد کی بدگمانی تھی اور ڈرتے تھے۔ کہ ہم لوگوں پر وہابیت کا کوئی اثر نہ پڑ جائے۔ دوسری طرف علمی حیثیت سے بھی طبیعت میں ایسی بلندی واقع ہوئی تھی۔ کہ کوئی ان کی نگاہ میں جچتا نہ تھا۔ خود طرح طرح کے مشاغل جاری کر رکھے تھے۔ اس لئے پورا وقت نکالنا مشکل تھا۔ اور اسی لئے اس بارے میں ہر آج متفکر رہتے تھے۔"

تربیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر بیان کیا ہے:۔

"والد کی تربیت اس درجہ شدید اور سخت تھی۔ کہ بہت کم لوگوں کو اس کا تصور بھی ہو سکے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ باہر کی ذرا سی بھی آب و ہوا ہمیں گندا کر دے گی۔ انہوں نے ابتدا ہی سے یہ اسلوب رکھا تھا کہ ہماری پوری دنیا کھیل کود کی۔ سیر و تفریح کی تعلیم کی۔ جو کچھ تھی۔ صرف اپنا مکان یا ان کا حلقۂ تربیت۔ بجز ان کی معیت یا اجازت کے جو بہت کم وقوع میں آتی تھی ہم چوکھٹ سے باہر قدم نہ رکھ سکتے تھے۔"

ان حالات میں مولانا کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ اس کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ مولانا کے والد جو اپنے وقت کے مجتہد اور مشہور عالم تھے۔ اُن سے اور اُن کی وساطت سے دوسرے کاملین اور اساتذہ سے انہیں تعلیم و درس کا موقعہ ملا۔ اور پھر ایک ایسے ماحول میں جہاں سوائے لکھنے پڑھنے، کتاب و قلم اور درس و تدریس کے اور کچھ نہ تھا۔ تدرتاً اُن کے ذہن میں تعلیم کی طرف گہری رغبت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ یہ ایک چیز تھی۔ جو اس ماحول میں کھیل و کود۔ سیر و تفریح اور دوسرے مشاغل کے مترادف تھی۔ اسی عہد کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:۔

"لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں۔ مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشے میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر ضرور دیکھا ہوگا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ کہ باہر

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

ڈاکٹر سید محمود۔ (سابق وزیر خارجہ ممبر پارلیمنٹ)

انکی زبان میں جادو تھا

۱۸۸۸ء میں مکہ معظمہ میں ہندوستان کا وہ مایہ ناز فرزند پیدا ہوا جس نے نہ صرف ہندوستان کی آزادی میں نمایاں حصہ لیا بلکہ اردو صحافت میں ایک نئے اور تاریخی باب کا آغاز کیا۔ کلکتہ سے "الہلال" کا اجراء نہ صرف اردو صحافت میں انقلاب لایا بلکہ ہندوستان کی سیاست پر بھی اثر انداز ہوا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ الہلال مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی انقلاب کا داعی ثابت ہوا۔ اور جلد ہی انگریزوں کی نظروں میں معتوب ہو کر بند ہو گیا۔ لیکن مولانا نے جلدی اس کا نعم البدل البلاغ تلاش کر لیا۔ اس کا بھی انجام الہلال ہی کا سا ہوا۔ بعد ازاں مولانا کی سرگرمیوں اور آزادی کی امنگوں نے انہیں کلکتہ سے شہر بدر ہونے پر مجبور کیا آخر کار رانچی میں نظر بند ہونا پڑا۔

احمد نگر کے قید خانہ میں اپنی معرکتہ الآرا کتاب غبار خاطر لکھی۔ اس میں مولانا نے بہت سے فلسفیانہ اور علمی مباحث چھیڑے ہیں۔ مولانا نے تمام ان معیبتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ جو ان کے سامنے پیش آئیں۔

پہلے ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے صدر مقرر ہوئے اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور مسلسل ۷ سال تک اس عہدے پر فائز رہے ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کے سلسلہ میں گرفتار کر لئے گئے۔ رہائی کے بعد شملہ کانفرنس اور برطانوی وزارتی مشن سے گفت و شنید بھی۔ انھیں کی سرکردگی میں انجام پائی۔

میرا مولانا کا ساتھ شروع ہی سے رہا ہے وہ ایک سچے دوست وطن پرست اور زبردست سیاستداں تھے انہوں نے اپنی زندگی کو وطن کی خدمت اور ہندوستان کی آزادی کے لئے وقف کر رکھا تھا یہ اُن کی سب سے بڑی آرزو تھی کہ وہ ہندوستان کو اپنی زندگی میں آزاد دیکھ لیں اور خدا نے ان کی اس آخری خواہش کو بھی پورا کیا۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد آپ کو وزیر تعلیم کا عہدہ سونپا گیا اور آپ نے آخر دم تک اسکو خوش اسلوبی سے نبھایا۔ اور آزاد ہندوستان کی موجودہ تعلیمی ترقی انھیں کی مساعی کی مرہون منت ہے۔

ان کی موت ایک ایسا زبردست سانحہ ہے جو آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ ہندوستان ایک مدبر ایک زبردست عالم سے خالی ہو گیا ہے یہ ایک ایسا خلا ہے جو آسانی سے پر نہیں کیا جا سکتا مولانا کو مذہب اور قوم کا جس قدر درد تھا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا انہوں نے قومی زبان کی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کی ساتھ ہی ساتھ زبان کے مسئلہ کو بھی اپنی دانائی اور عقلمندی سے کسی حد تک سلجھا دیا۔

انہوں نے بارہا اپنی تقریر اور تحریر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی زبانوں کے معاملے میں ہمیشہ رواداری اور سوجھ بوجھ سے کام لینا چاہیئے ۱۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو اپنی وفات سے ایک ہفتہ قبل اپنی زندگی کی آخری تقریر اردو زبان کی بقاء اور اس کے تحفظ کے سلسلہ میں کی جو ایک اہم تقریر سمجھی جاتی ہے۔

تقسیم ہند کے مولانا از حد مخالف تھے اور آخر وقت تک اس کی مخالفت جاری رکھی اس کا داغ ان کے سینہ پر آخر وقت تک رہا وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تقسیم سے ملک کو اور خصوصاً مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان ہوا۔ اور اس کے تعلق میں اپنے سینہ کے داغ کو کیوں کر چھپاؤں اور کیوں کر دکھاؤں۔ وہ ایک زبردست مقرر مفکر اور صاحب قلم تھے ان کی زبان میں جادو تھا۔ ان کی تحریر قوموں کو غفلت سے ہوشیار کرنے کی قوت رکھتی تھی۔

ہندوستان کی آزادی کے حصول میں اوائل میں مولانا محمد علی مولانا شوکت علی حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے اور آخر وقت تک مولانا آزاد کے ریہ بہت بلند ہیں اور تاریخ اسکو بھلا نہیں سکتی۔ ترجمان القرآن ان کا ہمیشہ بڑا علمی کارنامہ ہے جس کی اہمیت ہماری آئندہ نسلیں سمجھیں گی افسوس یہ ہے کہ وہ کل انتیس پاروں کی تفسیر ختم کر کے اس کا انگریزی ترجمہ ہو رہا ہے۔ خدا پورا کرے۔ (سید محمود)

اختر بستوی۔

آفتاب غروب ہو گیا

ایک مذہبی عقیدے کے مطابق خدا کو جب بھی دنیا کو سنوارنا مقصود ہوتا ہے وہ اُسے بہت کچھ دینے کے بجائے صرف ایک عظیم شخصیت عطا کر دیتا ہے۔ چنانچہ جب قدرت کو اردو ادب کی دنیا کو نکھارنے کا خیال آیا تو اس نے اس کی نظم کو اقبال جیسا مفکر شاعر عطا کر دیا اور اس کی نثر کو آزاد جیسا ذہین ادیب

اُردو کی دنیا میں ۱۸۸۸ء میں طلوع ہونے والا یہ سورج بہت تھوڑے ہی عرصے بعد نصف النہار پر آ گیا۔ اور اس کی طلائی کرنیں اس زبان کے نثری خزانے کو زریں فن پاروں سے بھرنے لگیں۔

سارا ہندوستان چونک پڑا۔ ہر طرف سے نگاہیں اٹھیں۔

سیاست نے انھیں اپنی مدد کے لئے پکارا۔

مذہب نے اپنے منبروں پر آنے کی دعوت دی۔

خطابت نے ان سے اپنے اسٹیج کی زینت بڑھانے کی التجا کی۔

انھوں نے کسی کی بھی درخواست نامنظور نہیں کی۔

سیاست کا میدان ان کی شعلہ فشاں آواز سے گونجنے لگا!

مسجدوں کی محرابوں میں ان کی پرسوز صداؤں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

خطابت کے اسٹیج پر اُن کے بیش قیمت الفاظ بکھرنے لگے۔

ادب کا خزانہ بھرتا رہا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب سیاست نے آواز اٹھائی۔ "محی الدین ہمارے ہیں"

مذہب پکار اٹھا "مولانا ہمارے ہیں"

خطابت نے کہا "ابوالکلام ہمارا ہے"۔

ادب نے چیخ ماری - "نہیں آزاد ہمارا ہے"۔

آہ وہ کس کا تھا؟ فیصلہ مشکل تھا

لیکن قدرت نے اسے یہ کہکر آسان کر دیا "وہ کسی کا نہیں ہمارا ہے"

آفتاب غروب ہو گیا۔

روشنی غائب ہو گئی

علم و ادب مذہب خطابت اور سیاست کی دنیا تاریک ہو گئی۔

کسی نے سچ کہا ہے کہ مولانا ابوالکلام اگر یورپ میں ہوتے تو نہ معلوم کتنی انجمنیں ان کے نام پر قائم ہوتیں اور کتنے مطابع ان کی تصانیف کی اشاعت کے لئے وقف ہوتے مگر یہاں غلامی نے دوسرے جوہروں کی طرح قدر شناسی کا جوہر بھی کھو دیا۔

خدا اور رسول خدا کے پیغامات گھر گھر پہنچا دیجئے

قرآن اور عورت

قرآن مجید نے عورت کو قعر مذلت سے نکال کر کس طرح بام عروج پر پہنچایا کن کن فرائض کی ادائیگی کے لئے اس کو تنبیہہ کی اسلام نے عورت ذات پر کیا کیا احکام صادر کئے اس پر ایک مکمل کتاب قیمت ایکروپیہ ۵۰ نئے پیسے

اچھا خاوند

خاوند بیوی کا سرتاج ہے اس کے ہیچ و راحت پر تقدیر کا قلم چلتا ہے مگر اس کی عظمت کے عین مطابق اس پر بڑی بڑی ذمہ داریاں بھی ہیں ان ذمہ داریوں کو نظر انداز کر کے کوئی خاوند اچھا خاوند نہیں بن سکتا خاوند کے اخلاق و عادات، عقائد و اعمال اور طرز معاشرت وغیرہ قرآن و حدیث میں کھول کھول کر بیان کئے گئے ہیں۔

اس کتاب میں خاوند کو اس انداز سے تربیت دی گئی ہے کہ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں اس کتاب سے مدد لے کر بہار خلد کا لطف حاصل کر سکتا ہے قیمت ایکروپیہ ۵ نئے پیسے

اچھی بیوی

عورت اپنے گھر کی ملکہ ہوا کرتی ہے

بہت سے بگڑے ہوئے گھر جن میں بد نظمی اور بے برکتی - اختلاف و انتشار کی خاک اڑا کرتی تھی جب وہ گھر سلیقہ شعار بیوی کے انتظام میں آیا تو اس نے اس کی چمن بندی کی قسم قسم کے بیل بوٹے اگائے - یہ کیوں اور کیسے ہوا؟

یہ اس لئے اور اس طرح ہوا کہ ہماری کتاب **اچھی بیوی** نے عورتوں میں گھریلو زندگی سنوارنے کی ایک روح پھونک دی ہے ایک گھر میں جب ایک عورت یہ کتاب پڑھ کر سنورتی ہے تو محلہ کی عورتوں میں بھی یہ رنگ پھیلنے لگتا ہے اور ایک چراغ سے ہزاروں چراغ روشن ہوتے چلے جاتے ہیں -

قیمت ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

اعمال قرآنی

قرآنی اعمال و وظائف کا بہترین مجموعہ جس کو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رح تھانوی نے مرتب کیا ہے

اور اعمال و وظائف کے ترجمہ کے ساتھ ساتھ ان کی خاصیتیں بھی بتائی گئیں۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آج ہر گھر میں ضرورت ہے۔ قیمت صرف ایکروپیہ

اسلامی اخلاق

اخلاق کے پھولوں سے دنیا خالی تھی خدا نے اسلام کی پھلواری بھیجی اور اس نے اخلاق و عادات کے گلہائے رنگا رنگ کھلائے جس سے دنیا نمونۂ جنت بن گئی۔ اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ اسلام ایک گلدستہ ہے جس میں رنگا رنگ کے پھول ہیں، اخلاق عمل، سچائی، صبر و شکر خوف و توبہ کے بہترین نتائج اور حسد و کینہ ریا و دیگر برے

عقیدہ و عمل کے بدترین نتائج پر سیر حاصل تبصرہ ہے جو شخص ان اسلامی اخلاق سے آراستہ ہو جائے گا اسے ہر نظر شرف قبولیت سے نوازیگی - قیمت ایک روپیہ

ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس تالیف کی سب سے بڑی یہ خوبی ہے کہ بادل کی گرج معلوم ہوتی ہے نہ بجلی کی کڑک، نہ موسلا دھار بارش نہ سیلابی زور بلکہ خنک اور خوشگوار شبنم کی ہلکی پھوار۔

جلد اول ۴ روپے ۵ نئے پیسے جلد دوم ۳ روپے ۵۰ نئے پیسے (جلد سوم زیر طبع ہے)

شاہنامہ اسلام
چار جلدوں میں

شاعر اسلام حفیظ جالندھری

شاہنامہ اسلام تاریخ اسلام کی منظوم کتاب ہے جس میں ایسے ایسے واقعات درج ہیں جن کو پڑھ کر آپ کی رگ حمیت بھڑک

اٹھے گی - اور اسلام کی صحیح روح تازہ ہو جائے۔ بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے رف گلیز ڈونی جلد دو روپے مکمل چاروں جلدیں بارہ روپے -

ساتھ ایک جگہ صرف اس عظیم الشان کتاب ہی میں مل سکتے ہیں تقریباً بارہ سو صفحات گلیز و چکنا کاغذ قیمت مجلد ۱۵ روپے غیر مجلد ۱۲ روپے ۵۰ نئے پیسے -

قرآنی دعائیں

خدا کی عظمت و جلال کا یہ عالم ہے کہ نوری ملائکہ مقربین بھی لرزاں اور ترساں رہا کرتے ہیں۔ ایسی ذات کو اگر خاکی انسان پکارے تو کیا الفاظ اختیار کرے - اس کتاب میں وہ سب دعائیں درج کردی گئی ہیں جو بندے اپنے رب کے حضور پیش کرتے ہیں - قیمت ایک روپیہ

معارف السنہ

جن تعلیمات نے خاک نشین بدوؤں کو تخت جہاں بانی پر بٹھایا اور جن کی تجلیات سے آتشکدۂ فارس گل ہو گیا وہ تعلیمات آج بھی حرف بہ حرف ہمارے سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہیں - اگر ہم ان کو آج بھی سمجھ کر اپنے لئے آئین حیات بنالیں تو خدا کی رحمتیں اپنی گود میں لے لیں، اس کتاب میں رسول اکرم کی مشہور اور زندگی میں انقلاب پیدا کرنے والی احادیث کو جمع کر کے ایسے دل نشین عام فہم اور پُر مغز انداز میں سمجھایا گیا ہے کہ آج تک اردو کا دامن اس دولت بے بہا سے خالی تھا۔ احادیث کے ترجمے اور تشریح کے بعد ہر حدیث کے اجمالی واقعات کو تاریخ و سیر کی مستند کتابوں سے مفصل بیان کر کے یہ بھی بتادیا گیا ہے کہ فرامین رسول صلعم سے مسائل و معارف کی کتنی کرنیں پھوٹتی ہیں اور مومن کی زندگی کے کن کن گوشوں کو منور کرتی ہیں - قیمت چار روپے

شہید اعظم

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول + سیراب کر گیا تجھے خون رگ رسول

شہادت امام حسین کا بیان اور ابوالکلام کی زبان اندازہ لگا لیجئے کس معیار کی یہ کتاب ہو گی قیمت ایکروپیہ ۵۰ نئے پیسے

رمضان کی باتیں
از:- صادق علی بستوی

اسلامی عبادات میں روزہ ایک اہم عبادت ہے اور یہ فریضہ سال بہ سال مسلمانوں پر عاید ہوتا ہے - یہ سخت ہمت آزما عبادت ہے - اگر اس کو پورے شرائط کے ساتھ ادا نہ کریں تو محنت شاقہ کے باوجود کچھ نہیں ہاتھ آسکتا اس لئے ضروری ہے کہ اس کے جملہ آداب کا علم ہو اور اس کے مطابق عمل کیا جائے۔ یہ کتاب روزہ کی تاریخ، روزہ کی افادیت، روزہ کی حقیقت، روزہ کے فضائل نیز ممنوعات و مکروہات اور تمام مسائل پر جامع کتاب ہے، کتابت طباعت اور کاغذ اعلیٰ سرورق خوبصورت قیمت ایک روپیہ پچاس نئے پیسے ۱/۵۰

حیات سرور کائنات صلعم
از - مُلا واحدی

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ترجمہ: - رسول اللہ کی زندگی تمہارے واسطے نمونہ ہے لیکن جب ہی تو جب آپ کو یہ علم ہو کہ حضور کی زندگی کیا تھی یہ جاننے کے لئے مولانا واحدی صاحب کی کتاب حیات سرور کائنات صلعم کا مطالعہ ضروری ہے، واحدی صاحب کا انداز بیان دلکش، لطیف، شیریں اور مؤثر ہے کتاب اول سے آخر تک دلی کی دھلی ہوئی زبان میں لکھی گئی ہے، رسول مقبول کی زندگی کا ہر واقعہ ساتھ کے ساتھ ذہن نشین

تاج بہشتی زیور
مکمل و مدلل محشی

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رح تھانوی

اسلامی معلومات کا دریا کوزہ میں

اس اسلامی انسائکلو پیڈیا کے بارے میں اگر یہ کہا جائے تو بالکل بجا ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر کوئی مسلمان حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا۔ چونکہ ایک مسلمان کے پیدا ہونے سے مرنے تک کے تمام ضروری مسائل شرعیہ نہایت تفصیل سے اور تحقیق کے

کانگریس کا دماغ

کانگریس کی اس غیر معمولی جماعت یعنی ورکنگ کمیٹی کی طرف رجوع کیجئے! یہ اصل میں اس کی روح رواں ہے۔ اگرچہ منصبی طور پر اس میں کسی کو ایک دوسرے پر فوقیت نہیں ہے۔ تاہم ان میں سے تین شخصیتیں بہت زیادہ سربرآوردہ ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے علاقے کا سیاسی منتظم اور فی الواقع ڈکٹیٹر ہے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل بمبئی، سندھ، مدراس، اور سی پی میں مولانا ابوالکلام آزاد بنگال پنجاب شمال مغربی سرحدی صوبہ اور یو پی میں۔ اور بابو راجندر پرشاد بہار، آسام، اور اڑیسہ میں۔

اگرچہ یہ تینوں نام دنیائے مغرب کے واسطے کچھ نامانوس سے ہیں۔ اور پھر نئے ہونے کی وجہ سے یاد رکھنے اور ادا کرنے بھی مشکل ہیں۔ تاہم اگر گاندھی اور نہرو کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ تینوں شخصیتیں فی الواقع بہت وسیع اور عظیم الشان ہیں۔ ان کے ناموں سے چشم تصور خواہ کچھ نہ اخذ کر سکے لیکن ان کی سوانح عمریاں اور ان کی سیرتیں اپنے اندر بہت کچھ چھپائے ہوئے ہیں۔ اور ان مغلق ناموں کے پیچھے انتہائی دلچسپ اور موثر ہستیاں پوشیدہ ہیں۔ اور پھر مزید برآں ان علاقائی ارباب ثلاثہ میں سے مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور سردار پٹیل ہیں ایک دوسرے سے قابل تصور حد تک عدم مشابہت ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں کی دنیائیں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں۔ لیکن یہ صرف کانگریس ہی کا رشتہ ہے۔ جو ان دو متضاد طبائع کو ایک دھاگے سے منسلک کئے ہوئے ہے۔

مولانا آزاد کی عمر پچاس کے قریب ہوگی وہ ایک فلاسفر اور مسلم عالم دین ہیں۔ اور یقیناً دنیائے مشرق کے بہت بڑے علماء و فضلا میں سے ایک، وہ کتابوں کے کیڑے صاحب فراست عالم متبحر اور قرآن حکیم پر ایک جدید مگر بہترین تفسیر کے مصنف ہیں۔ وہ ۱۸۸۸ء میں مکہ میں پیدا ہوئے اور قاہرہ کی مشہور عالم یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ یہ محیر العقول اور نادرہ روزگار شخصیت پندرہ سال کی چھوٹی سی عمر میں ہی فارسی، عربی، اور دینیات کی سنجیدہ اور متین عالم تھی۔

ہندوستان میں ان کے والد ماجد مقیم تھے وہ بھی وہاں تشریف لے گئے اور ۱۹۱۲ء میں ایک اردو جریدہ الہلال کی بنیاد رکھی، جس کو حیرت انگیز طور پر کامیابی نصیب ہوئی۔ مولانا راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود مذہبی عقائد کی تحقیق و تدقیق میں جدت پسند ہیں۔ اور پھر موجودہ اسلام کی طرف ان کا رویہ بھی تجدیدی اور اصلاحی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو قومی تحریک کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔ اور وہ ان معدودے چند ہستیوں میں سے ہیں، جنہوں نے

جان گنتھر

گاندھی جی کے میدان میں آنے سے پہلے یہ اہم تحریک شروع کی تھی۔ ۱۹۱۶ء کے ابتدائی زمانے میں انھیں انقلابی سرگرمیوں کی بنا پر نظر بند کر دیا گیا تھا جب ۱۹۲۰ء میں رہا ہوئے تو تحریک عدم تعاون کی سرگرمیوں میں بے طرح مشغول ہو گئے۔ ۱۹۲۳ء میں انھیں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اور کانگریس کی ساری تاریخ میں وہ سب سے کم عمر صدر تھے۔

مولانا کی یکتائے روزگار خصوصیت ان کی شخصیت میں دینی روایات عالیہ اور نظریات جدیدہ کا حیرت انگیز ربط و ضبط اور ترتیب و تعدیل ہے۔ الازہر جانے کے باوجود وہ بہت سے ہندوستانی رسم الخط کو لاطینی بنانا چاہتے ہیں اور مذہبی کتب میں استغراق و انہماک کے باوجود وہ ایک بہترین سیاسی مقرر اور نہایت زبردست صحافی ہیں۔

اگر سردار پٹیل کانگریس کے ارباب ثلاثہ میں ایک زبردست مکے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تو مولانا آزاد اس کے دماغ اور روحانی پیشوا اور بابو راجندر پرشاد اس کے دل ہیں۔

آزاد دوسروں کی نظر میں

آغا شورش کاشمیری ایڈیٹر چٹان

مولانا ابوالکلام کی خطابت، بہت سو، ڈیماستھنیز رچرڈ برنسلے، شریڈن، گلیڈسٹون، پارنل، دانیال ویبسٹر، ایڈمنڈ برک، سحبان، ابن غزالی اور سعد زغلول کی طرح یکتا و یگانہ وہ ایک نفسیاتی خطیب کی طرح مجمع کی ذہنیت افراد کے مزاج خیالات کی سرشت اور وقت کے رجحانات کو بخوبی سمجھتے ہیں اور ہمیشہ توضیح مطالب کے لئے ایسے اسالیب بیان اختیار اور ایجاد کرتے ہیں جن میں خطابت کی داخلی اور خارجی خوبیاں تکنیک، جوش روانی، تجربہ مشاہدہ، تمثیلات، استدلال، انوکھا پن، حقیقت اور جذبہ با اعتبار تناسب مضمر ہوتے ہیں اور ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ الفاظ کی سیع وضع معانی کے جوبن، بلاغت کے جوش، فصاحت، مستی تشبیہات کی چستی، تمثیلات کی خوبصورتی، استعاروں کی طرفگی تشبیہات کی دوشیزگی، خیالات کی پختگی اور فقروں کی لالہ طرازی سے ایسی فضا پیدا کرتے ہیں کہ بعض اوقات ہر گذرگاہ خیال پر ایک مغنی آتش نفس کے مضطرب ساز کی آوازیں محسوس ہوتی ہیں اور اکثر یہ خیال گذرتا ہے کہ دور صحراؤں میں عرب شہسواروں کی چمکتی ہوئی تلواریں سرخ فضاؤں میں لہرا رہی ہیں، یا قرن اول کے غزوات نے اپنے چہروں سے نقاب الٹ دی ہے۔

★★ مشہور امریکی صحافی لوئی فشر نے جو برطانوی وزارتی مشن کے دورہ ہندوستان کے وقت یہاں موجود تھا مولانا آزاد کے بارے میں اپنے تاثرات لکھے ہیں۔

مولانا صاحب خاموش سنجیدہ، حلیم الطبع اور زبردست علمیت و قابلیت کے مالک ہیں۔

بقیہ صفحہ ۲۲

جہاں آج مولانا آزاد کی آخری آرامگاہ ہے

لال قلعہ اور جامع مسجد کے درمیان اب جو میدان ہے۔ یہاں دہلی کے سب سے زیادہ گنجان محلے آباد تھے۔ قلعے کے لاہوری دروازے سے نکل کر جامع مسجد کی طرف جاتے تھے تو ایک بڑے پررونق بازار میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ یہ اردو بازار کہلاتا تھا یعنی فوج کا بازار۔ خانم کا بازار بھی اسی طرف تھا قلعہ کی خندق سے لے کر سڑک تک اب کھلا میدان ہے۔ اس میدان میں بھی محلے آباد ہو گئے تھے۔ زیادہ تر امراء کی بڑی بڑی حویلیاں تھیں۔ قلعہ میں انھیں نوبت بہ نوبت حاضر باش رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے یہیں مکانات تعمیر کر لئے تھے۔ قلعہ محلوں اور عمارتوں کے احاطہ سے چھپ گیا تھا۔ جب تک خندق پر نہیں پہنچتے تھے، قلعہ کی دیواریں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔

(ابوالکلام آزاد)

آزاد نمبر میں تعاون کیلئے شکریہ

اگر عشق خلل ہے دماغ کا تو یقیناً اچانک آزاد نمبر شائع کرنے کا فیصلہ بھی ایک ایسی ہی عبارت ہے امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد قدس اللہ سرہٗ العزیز کی ذات سے عشق و محبت کبھیا دماغی خلل کہ ہمیں جمہوریت نمبر شائع کرتے وقت اچانک یہ خیال آیا کہ آزاد نمبر شائع کیا جائے اور ۲ فروری کو ہم نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا۔ کہ حضرت مولانا آزاد کی تیسری برسی کے موقع پر ایشیا کا آزاد نمبر شائع کیا جائے اس تھوڑی سی مدت میں جتنی کچھ بھاگ دوڑ ہو سکتی تھی وہ ہم نے کی اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے سامنے ہے اس نمبر سے جب ہماری ہی تشنگی نہیں بجھی تو ہم کیسے سمجھیں کہ آپ سیراب ہو جائیں گے۔

ہر نوع سے یار زندہ صحبت باقی

خدا نے چاہا تو ہم آئندہ سال ایک ایسا معرکۃ آرا نمبر پیش کریں گے کہ آپ کو کوئی شکایت باقی نہ رہے گی لیکن اس نمبر میں جن رہنماؤں اور اہل قلم حضرات نے تعاون کیا اُن کا شکر گذار نہ ہونا بھی احسان ناشناسی ہوگی۔ اس لئے کہ ۲ فروری ۱۹۶۱ء کو ہم نے اس سلسلہ میں ہندوستان کے بہت سے رہنماؤں اور اہل قلم حضرات کو خطوط لکھے اور ۱۲ فروری تک اُن کے مضامین و پیغامات طلب کئے ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی قلیل مدت نوٹس تھا۔ لیکن اس پر بھی نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن راجستھان کے گورنر سردار گورمکھ نہال سنگھ، وزیر اعظم جموں و کشمیر جناب بخشی غلام محمد، سفیر مملکت سعودیہ ہز ایکسی لینسی شیخ یوسف الفوزان، ڈاکٹر سید محمود ممبر پارلیمنٹ۔ گیانی گورمکھ سنگھ ممبر پارلیمنٹ۔ جناب امن لکھنوی چیرمین پبلک ریلیشنز کمیٹی دہلی جناب رام لال ورما ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز دہلی، سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست۔ حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، پروفیسر محمد اجمل خاں نے اپنی بے پناہ عوامی مصروفیتوں کو پس پشت ڈال کر ہماری درخواست کو قبول کر کے قلمی تعاون فرمایا۔ جس کے لئے ادارہ ایشیا اپنی جانب سے اور اپنے قارئین کرام کی جانب سے اُن کا شکر گذار ہے۔ امید ہے یہ حضرات اور قارئین کرام ہماری کوتاہیوں کو نظر انداز فرمائیں گے۔

(ایڈیٹر)

× × × × × × × ×

اس کے عزائم بلند اس کی تمنا جلیل

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

کانگریس کی رہنمائی میں مولانا آزاد کا تاریخی پارٹ

مولانا ابوالکلام آزاد نے جنگ آزادی کی تحریک اور کانگریس کی رہنمائی کرنے میں جو شاندار اور تاریخی پارٹ ادا کیا ہے وہ اب کسی سے پوشیدہ نہیں رہا ہے اور "انڈیا ونس فریڈم" (مولانا آزاد کی انگریزی سوانح حیات) کی اشاعت کے بعد تو اس کی کہانی ہر زبان اور قلم پر ہے۔ یہاں ہم مولانا کی اس تاریخی کتاب سے جستہ جستہ اس کے اقتباسات پیش کریں گے۔ لیکن اسکو پیش کرنے سے قبل کانگریس کی ایک اور عظیم المرتبت ہستی کی زبانی اس سلسلہ میں شہادت پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ مولانا کی اس کتاب پر حاسدین و مخالفین ابوالکلام آزاد کا ایک اعتراض یہ ہے کہ یہ خود ستائی ہے اور کتاب میں اول سے آخر تک "میں" (I) ہی "میں" بھرا پڑا ہے — ٹھیک کتاب "میں" سے شروع ہوتی ہے اور میں ہی پر ختم ہوتی ہے۔ اول تو ایک شخص جب اپنی سوانح حیات بیان کر رہا ہے تو اسکو "ہم" (WE) یا کسی "اس" (HE) سے کیا سروکار ہو سکتا ہے۔ دوسرے وہ "میں" (I) کوئی معمولی "میں" نہیں ہے ایک تاریخی "میں" ہے اور اس "میں" سے کانگریس کی نصف صدی کی عمارت کے در و بست آرا ... میں اور اس کی شہادت میں پنڈت نہرو کے یہ الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ جو انھوں نے مولانا کے سلسلے میں لکھے ہیں۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگوں میں مجھے ان کو بغور مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اور بالخصوص پچھلے دس بارہ برس سے تو مجھے ان سے بہت گہرا تعلق رہا ہے۔ اگر ہمارے ایام قید و بند اور میری ہندوستان سے غیر حاضری کے زمانے کو اس میں سے مستثنیٰ کر دیا جائے تو کانگریس کے روزانہ مشاغل اور اس کی عظیم الشان تجویزوں اور اہم فیصلوں میں مجھے ان کو مسلسل رفاقت کی عزت حاصل رہی ہے کانگریس کی تاریخ میں اور بنا بریں ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم لوگ اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ کانگریس کی تجاویز و عزائم کی تراش خراش اور وضع قطع میں ان کا زبردست ہاتھ کس طرح مصروف کار رہا ہے قطع نظر اسکے کہ وہ پریذیڈنٹ ہوں یا ورکنگ کمیٹی کے ایک عام ممبر۔ ان کے آزاد مشورے غیر معمولی طور پر وقیع سمجھے جاتے ہیں کیونکہ ان مشوروں کے پس پردہ دانش و تدبر اور فہم و فراست کی غیر معمولی پختگی اور گھلاوٹ روز بروز نمایاں تر ہوتی جا رہی تھی۔

مولانا آزاد ۱۹۱۶ء میں رانچی میں نظر بندی کے بعد ۱۹۲۰ء میں رہا ہو کر عملی سیاست کے میدان میں آئے۔ گاندھی جی اس وقت تک مطلع سیاست پر نمودار ہو چکے تھے جنوری ۱۹۲۰ء میں دہلی میں مولانا کی گاندھی جی سے ملاقات ہوئی اس وقت خلافت کا مسئلہ سامنے تھا۔ اس کی گاندھی جی نے تائید کی جب وائسرائے نے خلافتی وفد کو ٹکا سا جواب دیدیا اور کچھ کرنے سے انکار اور معذرت ظاہر کی تو سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے؟

اس مرحلہ پر مہاتما گاندھی نے ترک موالات کی تحریک پیش کی۔ مولانا آزاد "انڈیا ونس فریڈم" میں لکھتے ہیں۔

انھوں نے تجویز پیش کی کہ تمام سرکاری خطابات واپس کر دیئے جائیں عدالتوں اور تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ہندوستانی ملازمتوں سے جواب دیدیں اور نو ساختہ مجلس قانون ساز میں حصہ لینے سے انکار کر دیں۔

اس تجویز پر مولانا کہتے ہیں کہ مجھے یاد آیا کہ ایسی ہی تجویز ۱۹۰۱ء میں شاہ اطالیہ پر ایک انتہا پسند کے حملے کے بعد ٹالسٹائی نے پیش کی تھی اور مجھے یہ بھی یاد آیا کہ اسی قسم کا پروگرام میں نے الہلال کے بعض مضامین میں پیش کیا تھا۔ اس پر جہاں دوسرے لوگوں میں سے کچھ نے تامل کیا کچھ نے مخالفت کی اور کچھ نے کچھ ترمیم و تنسیخ کی بات سوچی وہاں مولانا فرماتے ہیں "میں نے ایک لمحہ کے تامل بغیر کہا کہ یہ پروگرام کلی طور پر منظور ہے" پھر مولانا نے اس کی حمایت میرٹھ کانفرنس میں کی جہاں گاندھی جی نے پہلے یہ پروگرام پیش کیا اور مولانا نے تائید کی۔ اس کے بعد دونوں نے پورے ملک کا دورہ کر کے رائے عامہ کو ہموار کیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔

چند ہفتے بعد میرٹھ میں ایک خلافت کانفرنس منعقد ہوئی یہی وہ کانفرنس تھی جس میں گاندھی جی نے پہلی بار پبلک پلیٹ فارم سے ترک موالات کا پروگرام پیش کیا جو وہ بول چکے تو میں نے اس کی تائید اور اپنی غیر مشروط حمایت کا اعلان کیا

اب کانگریس ایک فعال اور نڈر جماعت بن گئی تھی اور آزادی کی تحریک ایک باقاعدہ تحریک کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ چنانچہ دارو گیر کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا بھی گرفتار ہوئے اور دوسرے لیڈر بھی پکڑے گئے۔ مولانا کے ساتھ بنگال کے مشہور قومی رہنما داس بھی گرفتار ہوئے تھے لیکن وہ کچھ پہلے رہا ہو گئے۔ انھوں نے رہائی کے بعد گیا میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی یہاں کانگریس میں اختلاف رونما ہوا۔ اور یہ اختلاف کانگریس پروگرام پالیسی میں تبدیلی سے تعلق رکھتا تھا مسٹر سی۔ آر۔ داس پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں کونسلوں میں داخلہ کے حق میں تھے۔ یہ گروپ CHANGERS کا تھا دوسرا گروپ گاندھی جی کے کٹر حامیوں کا تھا وہ اس کا مخالف تھا اور NO CHANGERS کے نام سے مشہور رہے

مولانا لکھتے ہیں کہ جب میں باہر آیا تو میں نے دونوں گروپوں میں مفاہمت کی کوشش کی اور ستمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے اسپیشل سیشن میں ہم ایک سمجھوتے پر متفق ہو گئے۔ اس وقت میری عمر ۳۵ برس کی تھی اور مجھے کانگریس کے اجلاس کی صدارت کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ یہ سمجھوتا کیا تھا یہ بھی سمجھ لیجئے۔ مولانا آزاد نے یہ فارمولا پیش کیا تھا کہ جو گروپ کونسلوں کے داخلے کے حق میں ہے وہ وہاں جا کر کام کرنے اور اس کا جو مخالف ہے وہ باہر رہ کر پروگرام چلائے۔ اس طرح گویا مولانا آزاد کے سر کانگریس کو پارلیمانی سیاست میں لانے کا سہرا بھی

کانگریس میں پھوٹ

یہی مجالس قانون ساز میں داخلہ کا مسئلہ ایک بار پھر وجہ اختلاف بنا۔ جب ۱۹۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کے تحت صوبوں کو خود مختاری اور مرکز میں ایک وفاقی حکومت کی تجویز آئی تو کانگریس نے اس کی مخالفت کی وہ صوبوں سے متعلقہ اسکیم کے بھی خلاف تھی بلکہ ایک طبقہ تو الیکشن میں حصہ لینے کے بھی خلاف تھا۔ مولانا لکھتے ہیں میرے خیالات بالکل مختلف تھے۔ میری رائے یہ تھی کہ الیکشن کا بائیکاٹ کرنا ایک غلطی ہوگی۔ اگر کانگریس نے ایسا کیا تو ناپسندیدہ عنصر مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز پر قبضہ کرے گا اور ہندوستانیوں کے نام پر نمائندگی کرے گا۔ علاوہ ازیں انتخابی مہم عوام کو ہندوستانی سیاست کے بنیادی نکات سمجھانے کا ایک شاندار موقعہ فراہم کریگی۔ آخر اس نے جو نظریہ پیش کیا تھا وہ قبول کر لیا گیا اور کانگریس نے انتخابات میں حصہ لیا۔ اور اس کے وہی نتائج نکلے جن کی میں نے پیش گوئی کی تھی۔

انتخابات کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوا کہ کانگریس عہدے قبول کرے یا نہ کرے اس نے تقریبًا تمام صوبوں میں اکثریت حاصل کی تھی۔ مجالس قانون ساز میں جواہر لال جی کانگریس کے صدر تھے وہ عہدوں کو قبول کرنے کے خلاف واضح الفاظ میں بیان دے چکے تھے چنانچہ واردھا میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تو مولانا لکھتے ہیں۔

"چنانچہ میں نے واضح الفاظ میں یہ تجویز پیش کی کہ کانگریس کو عہدے قبول کر لینا چاہئیں کچھ بحث مباحثہ کے بعد گاندھی جی نے میرے نظریہ کی تائید کی اور کانگریس نے صوبوں میں وزارتیں بنانے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلہ کے بعد کانگریس نے ایک پارلیمنٹری بورڈ مقرر کیا جس میں تین آدمی تھے ڈاکٹر راجندر پرشاد مولانا ابوالکلام آزاد اور سردار ولبھ بھائی پٹیل اور مولانا۔ بنگال۔ بہار، یوپی، پنجاب سندھ اور صوبہ سرحد کے انچارج مقرر کئے گئے۔

(باقی صفحہ ۲۷ پر)

اُردو صحافت اور مولانا ابوالکلام آزاد

از پروفیسر حافظ شمس الدین صاحب شمس منیری ایم اے بی ایل

مولانا آزاد نے جب اردو صحافت کے میدان میں قدم رکھا اس سے پہلے تک اردو صحافت کا گویا دور طفلی تھا۔ پیسہ اخبار لاہور مولوی محبوب عالم کی ادارت میں نکلتا تھا یہ نہایت پرانا اور مقبول اخبار تھا۔ مگر یہ درحقیقت خبروں ہی کا اخبار تھا۔ علمی مضامین سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے بعد وطن لاہور اور وکیل امرتسر کا دور آیا۔ وطن، وکیل سے زیادہ پرانا تھا۔ اور زیادہ مقبول بھی تھا۔ اس کے مدیر مولوی انشاء اللہ خاں ایک سنجیدہ اور ذی علم شخص تھے۔ انہوں نے متعدد کتابیں تصنیف بھی کی تھیں جن میں "جنگ پلونا" (ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ) سب سے زیادہ مقبول اور معروف ہوئی۔ اسی کتاب کے ذریعے سے اردو دانوں کو سلطان عبدالحمید خاں ثانی سلطان ترکی اور ان کے شیر دل جنرل عثمان پاشا کے کارنامے معلوم ہوئے مولوی انشاء اللہ خاں کو خلافت اسلام سے خاص دلچسپی تھی اور حجاز ریلوے کی تحریک میں انہوں نے خاصہ حصہ لیا تھا۔ ان وجوہ سے ان کا اخبار وطن کافی مقبول تھا وکیل اس کے مقابلہ میں پھیکا پھیکا معلوم ہوتا تھا۔ مگر جب مولانا آزاد نے باوجود صغر سنی وکیل کی ادارت سنبھال لی تو یکایک اس کی ظاہری اور معنوی حیثیتوں میں ایک انقلاب آگیا۔ اس کی ظاہری حالت بہت سنبھل گئی۔ نہایت اچھے کاغذ پر چھپنے لگا کتابت بھی صاف اور خوبصورت ہوگئی۔ معنوی طور پر بھی اس نے نمایاں ترقی کی اس میں سنجیدہ اور وقیع مضامین چھپنے لگے اور اس کے مقابلہ میں اب وطن دبنے لگا۔ مگر وطن کا اصلی رقیب وکیل نہیں بلکہ اخبار زمیندار لاہور ثابت ہوا۔ جب مولوی ظفر علی خاں مرحوم نے اس کی ادارت اختیار کی تو انہیں زمیندار کا حریف وطن ہی نظر آیا۔ انہوں نے اس کی ایسی خبر لی کہ بیچارہ وطن تھوڑے ہی دنوں میں قعر گمنامی میں گر گیا اور یوں کہنا چاہیے کہ بے موت مر گیا۔ دنیائے صحافت میں بوڑھے انشاء اللہ خاں کا مقابلہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے دنیائے شاعری میں انشا اور مصحفی کا۔ مولوی انشاء اللہ خاں پرانے وقت کے ایک سنجیدہ بزرگ تھے اور خلافت اسلامیہ سے ہمدردی رکھنے کے باوجود حکومت انگلشیہ سے بہت ڈرتے تھے اور اس کے خلاف کسی تحریک میں شریک ہونا کجا کہ ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتے تھے۔ مولوی ظفر علی خاں صاحب علیگڈھ کے صرف گریجویٹ ہی نہیں تھے۔ بلکہ اردو فارسی ادب کے فاضل بھی تھے۔ ساتھ ہی نہایت پرجوش اور جنگجو طبیعت رکھتے تھے۔ انہوں نے جب انگریزی حکومت کے خلاف پنجاب میں جماعت احرار کی تنظیم کی تو مولوی انشاء اللہ خاں کے خلاف گویا صف آرا ہو گئے۔ انشاء اللہ خاں نے اس تحریک کی مخالفت کی اور اس طرح ان میں اور مولوی ظفر علی خاں میں اَن بن ہو گئی۔ اور دونوں اخباروں میں ایک دوسرے کے خلاف نوک جھونک ہونے لگی۔ علامہ شبلی نے جب تحریک احرار کی حمایت کی تو انشاء اللہ خاں نے ان کی بھی مخالفت کی۔ آخر وطن اخبار مولانا ظفر علی خاں کی تیز و تند نگاری کی تاب نہیں لا سکا اور ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی طرح بجھ کر رہ گیا۔

مولانا آزاد اگرچہ صحافت سے لگاؤ پیدا کر چکے تھے اور وکیل کے علاوہ الندوہ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے تھے مگر اب تک اس میدان میں کھل کر نہیں آئے تھے ان کا قیام زیادہ تر کلکتہ میں اپنے والد ماجد مولانا خیرالدین صاحب کے زیر سایہ رہتا تھا۔ مولانا خیرالدین صاحب عالم ہونے کے علاوہ بڑے پایہ کے صوفی اور بڑے مقبول اور ہر دلعزیز پیر تھے۔ صرف کلکتہ میں ان کے لاکھوں مرید اور معتقد تھے اس وجہ سے مولانا آزاد بھی نہایت خوش باش اور رنگیلانہ زندگی گذارتے اور بے تکلف دوست احباب کے ساتھ ہر قسم کی آزاد صحبتیں رہتی تھیں۔ راقم کے ماموں مولوی غلام محمد صاحب مرحوم بھی مولانا کے اس دور کے خاص دوستوں میں سے تھے اور عرصہ تک ان کے خلوت و جلوت کے شریک رہے مگر ان کا بیان ہے کہ مولانا خیرالدین صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں مولانا کی طرف توجہ کی اور تخلیہ میں ان کو تلقین کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں مولانا کی طبیعت کا رنگ بدل گیا اور مولانا نے ان صحبتوں کو خیر باد کہا۔ بلکہ دوستوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا۔ چنانچہ ماموں صاحب فرماتے تھے کہ ان ایام میں کئی بار وہ مولانا کے یہاں گئے۔ اور ملاقات کے کمرے میں دیر تک منتظر بیٹھے رہے مگر یا تو مولانا خلوت سے باہر ہی نہیں آئے یا آئے تو سرسری ملاقات کرکے اور خیر و عافیت دریافت کرکے واپس لوٹ گئے نتیجہ یہ ہوا کہ دوستوں کی آمد و رفت بھی مولانا کے یہاں نہیں رہی۔ اس کے بعد جب مولانا خیرالدین صاحب کا انتقال ہوا تو ان کے مریدوں نے مولانا کو ان کی جگہ سجادہ نشین بنانا چاہا مولانا میں اگر دور حاضر کے صوفیوں اور خلیفوں کی طرح کچھ بھی حرص دنیا ہوتی تو ان کے لئے اس سے بہتر موقع نہیں تھا۔ ان کے والد مرحوم کے ہزاروں لاکھوں مرید جاں نثاری کے لئے حاضر تھے۔ پھر خود مولانا کی شخصیت ایسی جاذب تھی کہ اگر یہ سلسلہ ارشاد و ہدایت، مروجہ تصوف کے طریق پر پھیلاتے تو ان کے بھی لاکھوں جاں نثار مرید ہو جاتے اور ان کے قدموں پر زر و جواہر کا ڈھیر لگا دیتے جیسا کہ مولانا نے خود ایک موقعہ پر فرمایا کہ اگر میں چاہتا تو لوگوں سے اپنی پوجا کرواتا۔ مگر مولانا کی غیور طبیعت نے اس طرح ہاتھ پاؤں توڑ کر حجرے میں بیٹھ جانے والی زندگی کو پسند نہیں کیا بلکہ وہ میدان صحافت میں اپنی تمام فطری صلاحیتوں اور علمی قابلیتوں کے ساتھ نکل آئے اور دیکھتے دیکھتے کاروان صحافت کے قافلہ سالار بن گئے۔

الہلال افق کلکتہ سے نکلا اور اس آب و تاب سے نکلا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ مولانا کا ذوق جمالیات اتنا بلند تھا کہ اس سے کم درجہ کی چیز وہ نکال ہی نہیں سکتے تھے۔ اس کی ظاہری زیبائی و رعنائی بھی اس قدر دامن کش دل تھی کہ دیکھنے والا اسی پر فریفتہ ہو جاتا تھا۔ اس کی معنوی خوبیوں کی طرف تو دیر میں توجہ ہوتی تھی۔ خوبصورت و رنگین سرورق پر مولانا کے نام کے ساتھ "مدیر مسئول و محررہ خصوصی" کا فقرہ جاذب توجہ ہوتا تھا۔ آج کل یہ فقرہ رسالوں اور اخباروں میں عام طور پر مستعمل ہے۔ مگر بہت سے لوگوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اردو زبان میں مولانا ہی نے پہلے پہل اس فقرہ کو داخل کیا۔ ان سے پہلے لوگ اس سے آشنا نہیں تھے اور خدا جانے اپنے دور صحافت میں مولانا نے ایسے ایسے کتنے الفاظ اور فقرے اردو زبان و ادب میں داخل کئے جو آج کل سکۂ رائج الوقت بن گئے ہیں۔ مولانا نے جریدہ الہلال کی ظاہری صورت میں ایک انقلاب انگیز تجربہ یہ بھی کیا کہ اسے بجائے لیتھو کے ٹائپ میں چھپوانا شروع کیا۔ اور گو لوگ اس وقت تک اردو ٹائپ میں چھپی ہوئی چیزیں پسند نہیں کرتے تھے اور لیتھو کی نستعلیق ہی کے عادی تھے مگر الہلال کا ٹائپ میں چھپنا اس کی مقبولیت میں بالکل مانع نہیں ہوا۔ الہلال میں کاغذ بھی نہایت اعلیٰ سفید گلیز کا استعمال کیا گیا اور اس میں تصاویر کا بھی خاص اہتمام تھا۔ تصویروں کے بلاک نہایت عمدہ اور صاف ہوتے تھے۔ اکثر نوجوان ترکوں کی تصویریں الہلال میں نہایت دیدہ زیب انداز میں چھپتی تھیں۔ خصوصاً انور پاشا کی تصویر جو انجمن اتحاد و ترقی اور ترکی نوجوان تحریک کے روح رواں تھے مختلف موقعوں پر اور مختلف زاویوں کے لحاظ سے ہوتی تھی اور اس کے نیچے مولانا اس شعر کو لکھ کر تصویر میں اور بھی چار چاند لگا دیتے تھے ؎

ترا چنانکہ توئی ہر کسے کجا داند
بقدر طاقت خود می کند استدراک

پھر ان تمام خوبیوں اور زیبائیوں کے ساتھ الہلال نہایت پابندی وقت کے ساتھ نکلتا تھا اور مدتوں نکلتا رہا۔ اب رہیں الہلال کی معنوی اور باطنی خوبیاں تو ابتدا ہی سے اس کے مضامین میں ایسی کشش اور جاذبیت ہوتی تھی کہ لوگ ہفتہ بھر اس کے لئے چشم براہ رہتے تھے اور جہاں جہاں یہ رسالہ آتا تھا اس کے پہنچتے ہی ایک مجمع ہو جاتا تھا اور لوگ اس کو گھیر کر پڑھتے تھے۔ یہ راقم کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اور راقم اور اس کے کئی ہمنشین مولانا عمر کریم صاحب مرحوم کی کوٹھی میں پڑھا کرتے تھے وہیں الہلال پہنچ جاتا تھا اور ہم لوگ اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کیا کرتے تھے۔ مولانا عمر کریم صاحب کو گو سیاسیات سے دلچسپی تھی مگر ان کا ذوق خالص مذہبی تھا۔ وہ بھی ایک خاص جماعت یعنی بریلوی انداز کا، چنانچہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی کتاب الجرح علی البخاری تھا۔ اور مولانا ثناء اللہ صاحب مرحوم اہلحدیث امرتسر کے مقابلہ میں الفقہ کی سرپرستی بھی وہ بڑے جوش سے کرتے تھے۔ مگر خاندانی روایات کے لحاظ سے وہ بھی انگریزوں کے مخالف تھے۔ اس لئے کہ ان کے والد علی کریم صاحب انگریزوں کے باغی اور شاہ آباد کے راجہ کنور سنگھ کے دوست اور ندیم خاص تھے اور اسی وجہ سے انہیں اپنی بہت بڑی جائداد سے محروم ہونا پڑا اور عرصہ تک روپوش رہے اور گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کی۔ یہی وجہ تھی کہ الہلال میں جب کوئی تیز و تند مضمون انگریزی حکومت کے خلاف نکلتا تھا تو وہ بھی متوجہ ہو جاتے تھے اور شوق سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ ان دنوں ہم لوگوں کا یہی معمول تھا کہ ایک شخص بلند آواز سے الہلال پڑھتا تھا اور سب حلقہ باندھ کر سنتے تھے۔ اور سر دھنتے تھے۔

الہلال نے اردو زبان میں ایک خاص ادبیت کی بنا ڈالی اور اردو صحافت کا ایک نیا اور نہایت رفیع الزماں دبستان قائم کر دیا۔ مولانا کی تحریروں میں ایسا جادو ہوتا تھا کہ موافق و مخالف سبھی اس پر فریفتہ ہو جاتے تھے۔ مولانا اپنے جام بلوریں میں ایسی شراب دوآتشہ پیش کرتے تھے کہ پینے والا سرمست و بیخود ہو جاتا تھا۔ مولانا کی تحریر میں یہ وصف کیوں تھا اس کا تجزیہ اور تحصیل مشکل ہے۔

اچھے ادب سے لطف اندوز ہونا ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے جو لوگ اس کے وجوہ و اسباب تلاش کرتے ہیں وہ ادب پر ظلم کرتے ہیں۔ مولانا کے ادب کی چند خصوصیات بیان کی جا سکتی ہیں۔ سب سے نمایاں خصوصیت

(بقیہ صفحہ ۳۲ پر)

پیغام کے مضامین

"پیغام" کا پہلا افتتاحیہ بھی مولانا کے قلم کا شاہکار ہے۔ کچھ حصے ملاحظہ ہوں۔

معاشراں! گرہ از زلفِ یار باز کنید
شبے خوش است، بہ ایں قصہ اش دراز کنید

۱- جنوری سنہ ۲۰ء کو جب مجھے چار سال کے بعد نظر بندی سے رہا کیا گیا۔ تو میں اپنی آئندہ زندگی کے کاموں، اور کاموں کے طریق و اسلوب کی نسبت خالی الذہن نہ تھا۔ اور نہ اپنے ارادے کے بہنے کے لئے واقعات و حوادث کے کسی سیلاب کا منتظر تھا۔ میں نے ہمیشہ بہنے کی جگہ چلنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس وقت بھی اپنے سفر عمل کے لئے ایک طے شدہ راہ اختیار کر چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ اور میری مشغولیت کا عنوان و طریق کیا ہوگا؟

دنیا کے واقعات و حوادث، طوفان کی طرح اٹھتے اور سیلاب کی طرح آتے ہیں اور انسان کا کمزور ارادہ ہمیشہ اس کی سطح پر حباب کی طرح بہتا رہتا ہے۔ حکمت الٰہی نے اگرچہ انسان کو یہ طاقت بخشی ہے کہ اس طوفان و سیلاب کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو فرش زمین کی طرح اس کی لہروں پر بھی چل سکتا ہے۔ اور

خبر پیغام ہمدم و ہمراز کا افتتاحیہ

الہلال اور البلاغ کے علاوہ مولانا آزاد نے ایک اخبار پیغام بھی جاری کیا تھا۔ ذیل میں اس کا پہلا معرکہ آرا افتتاحیہ درج کیا جا رہا ہے۔ اس کو پڑھیئے اور مولانا کی انشا اور جذبات سے لطف لیجئے —

— ادارہ

دنیا ان عزائم سے کبھی خالی نہیں رہی ہے۔ جنہوں نے نہ صرف اس کا مقابلہ کیا ہے بلکہ مرکب کی طرح لگام لگا کر جس طرف چاہا ہے رخ پھیر دیا ہے، لیکن افسوس کہ زندگی اور ارادے کے اس کرہ میں بہت کم انسان ہیں جو خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو سمجھنا چاہتے ہیں اور ان سے بھی کم ہیں جو سمجھنے کے بعد برت سکتے ہیں

زمین پر درختوں کے جھنڈ ہیں جو ہوا سے ہلتے ہیں۔ کنکر پتھر کے ڈھیر ہیں۔ جن کو ٹھوکریں پامال کرتی ہیں۔ خس و خاشاک کے انبار ہیں جن کو آندھی اڑا لے جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کی بھی ٹولیاں ہیں اور بستیاں ہیں۔ جو اگرچہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ سوچتا اور ارادہ کرتا ہے لیکن جب حوادث امنڈتے ہیں۔ واقعات و تغیرات بہنے لگتے ہیں، تو وہ اپنی تمام ارادی امداد کی توتوں کو خیرباد کہہ دیتا ہے اور پھر درخت کی طرح گر کر پتھر کی طرح لڑھک کر خس و خاشاک کی طرح آناً فاناً بہہ جاتا ہے۔ مقام انسانیت کا منارہ بہت ہی بلند ہے۔ لیکن اس کی دیواریں جمادات کی سطح ہی سے بلند ہوئی ہیں۔ اس لئے اگر اس کی چوٹی گرے گی تو وہیں پہنچے گی جہاں سے بلند ہوئی تھی۔ قرآن کریم نے اسی طرف اشارہ کیا ہے

(۲)

سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک حوادث عالم کا سیلاب اگرچہ نہایت مہیب اور ہوش ربا تھا اور بہت مشکل تھا کہ ارادے اور فیصلے کی دیواریں اس کے مقابلہ میں قائم رہ سکیں۔ عنایت الٰہی کی دستگیری سے میں نے اپنے ارادے اور عزم کو اس وقت بھی قائم و استوار پایا اور ایک لمحے کے لئے بھی میرے دل پر مایوسی کا قبضہ نہ ملا۔ واقعات کی ابتلائی اور ناکامی میرے دل و جگر تو چیر دے سکتی تھی اور حوادث کی غمگینی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتی تھی لیکن وہ اس یقین و عزم کو نہیں نکال سکتی تھی جو اس کے ریشے ریشے میں بسا ہوا ہے۔ اور صرف اسی وقت نکل سکتا ہے۔ جب دل بھی سینے سے نکل جائے وہ زمین کی پیداوار نہیں ہے کہ زمین کی کوئی طاقت اسے پامال کر سکے۔ وہ آسمان کی روح ہے اور بحکم الٰہی۔

آسمان کی بلندیوں سے ہی اتری ہے پس نہ تو زمین کی امیدیں اسے پیدا کر سکتی ہیں نہ زمین کی مایوسیاں اسے ہلاک کر سکتی ہیں۔ عین سنہ ۱۹۱۸ء کے اواخر کے عہد میں جبکہ امیدوں اور آرزوؤں کی پوری دنیا الٹ چکی تھی اور اس کی ویرانیوں اور پامالیوں پر سے سیلاب حوادث پورے زور و شور کے ساتھ گذر چکا تھا۔ تو میں رانچی کے گوشہ عزلت میں بیٹھا ہوا ایک نئی دنیائے امید کی تعمیر کا سر و سامان دیکھ رہا تھا اور گو دنیا نے دروازے کے بند ہونے کی صدائیں سنی تھیں مگر میرے کان ایک نئے دروازے کے کھلنے پر لگے ہوئے تھے۔ ؎

تفاوت است میان شنیدن من و تو
تو بستن در و من فتح باب می شنوم

خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا حوالہ دیجئے

لے گئے۔ مہر صاحب نے ان کو لکھا کہ آپ کی اور ہماری سیاست میں جو بُعد ہے اس کا یہ نتیجہ تو نہ ہونا چاہئے کہ ہم آپس میں مل بھی نہ سکیں آپ اپنی مصروفیت ہی میں آئے اور غالباً اسی مصروفیت کے عالم میں واپس چلے جائیں گے تو پھر ہم جیسے نیاز مندوں کو استفادے کا موقع ملے تو کیونکر۔ مولانا نے پشاور سے لکھا کہ میں پشاور سے واپس روانہ ہوتے وقت آپ ہی کو تار دوں گا اور کسی کو میرے آنے کی اطلاع نہ ہوگی۔ آپ ریلوے اسٹیشن پر آجائیے۔ چونکہ یہاں کی ٹرین کے لاہور پہنچنے اور دہلی جانے والی ٹرین کے روانہ ہونے کے درمیان دو ڈھائی گھنٹے کا وقفہ ہے اس لئے بوجہ احسن ملاقات ہو سکتی ہے۔

جب مولانا کا تار آیا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ریلوے سٹیشن لاہور پر ممکن ہے بعض اور لوگ بھی مولانا سے ملنے آجائیں اور ہمارا مزا کرکرا ہو اس لئے گوجرانوالہ چلو۔ وہاں سے مولانا کے ساتھ ٹرین میں بیٹھ کر آئیں گے چنانچہ ہم گوجرانوالہ چلے گئے اور جب مولانا کی ٹرین پہنچی تو ان کے ڈبے میں داخل ہو گئے حسب معمول تپاک اور شگفتہ روئی سے ملے اور باتیں شروع ہوئیں۔ ہماری سیاست جداگانی پاکستانی۔ مولانا سر سے پاؤں تک نیشنلزم اور کانگرس میں مستغرق لہذا ہم مولانا سے کبھی سیاسی بات چیت نہ کرتے تھے۔ دو گھنٹے بہت دلچسپ اور مفید باتیں ہوئیں لاہور اسٹیشن پر کوئی کانگرسی موجود نہ تھا لہذا یہاں بھی بات چیت اور بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی جاری رہی۔ اس کے بعد کچھ گاندھی ٹوپیاں نظر آگئیں جن کو کسی طریقے سے مولانا کی آمد کی اطلاع ہو گئی تھی۔ چنانچہ ہم رخصت ہوئے اور مولانا کو کانگرسی اخبار کے رپورٹروں کے حوالے کر گئے۔

راشٹرپتی

اس کے بعد ایک دفعہ مولانا لاہور تشریف لائے اور میاں محمود علی صاحب بیرسٹر ایٹ لا خلف مولانا عبدالقادر قصوری کے ہاں دعوت چائے پر ملاقات ہوئی۔ اسی دن مولانا کانگرس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ یہاں بعض نوجوانوں نے اپنی عادت اور اپنے معمول کے مطابق مولانا پر سیاسی سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مولانا اپنے ذوق کے مطابق سنجیدگی سے جواب دیتے رہے لیکن جب عامیانہ جرح و قدح ہونے لگی تو بہت بیزار ہوئے اور مولانا عبدالقادر نے اس ناگوار صحبت کو ختم کر دیا۔

میاں افتخار الدین کے ہاں

پھر ایک دفعہ میاں افتخار الدین کے ہاں میں اور مہر صاحب حاضر خدمت ہوئے۔ ان دنوں لاہور میں جمعیت العلما کا اجلاس ہو رہا تھا جس پر میں نے "ریشتاغ" کی پھبتی کہی تھی۔ مہر صاحب نے یہ پھبتی مولانا کے گوش گزار کی۔ انھوں نے بہت داد دی اور کہا کہ لمبی لمبی جھالردار ڈاڑھیوں کے مجمع کو اس سے بہتر کیا نام دیا جا سکتا ہے پھر مجھ سے پوچھا کہئے سالک صاحب کیا مشغلے ہیں۔ میں نے عرض کیا وہی سیاست و صحافت کی خاک بازی فرمایا جی ہاں کوئی لگاؤ اور اٹکاؤ زندگی بسر کرنے کے لئے ضرور ہونا چاہئے۔ میں نے کہا کہ یہ کانگرس کی صدارت وغیرہ وہ بھی تو لگاؤ اور اٹکاؤ ہی ہے فرمانے لگے اس میں کیا شبہ ہے زندگی بغیر کسی اٹکاؤ کے بسر ہو ہی نہیں سکتی۔ مہر صاحب چونکہ مولانا سے بعض علمی مسائل پر بطور خاص گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ اور تخلیہ کے طالب تھے۔ اس لئے مولانا نے ان سے کہا کہ آپ صبح کا ذب کے وقت آئیے تو تخلیہ میسر آسکتا ہے چنانچہ مہر صاحب صبح ۴ بجے مولانا سے ملتے تھے ڈھائی گھنٹے قطعی تخلیہ رہتا تھا اور چینی چائے کا دور بھی چلتا تھا۔

فلیٹی ہوٹل میں

غالباً آخری دفعہ مولانا اس وقت لاہور آئے جب ملک خضر حیات خاں وزارت مرتب کر رہے تھے اور لیگ اور کانگرس کے درمیان کوئی مفاہمت زیر غور تھی۔ مولانا فلیٹی ہوٹل میں قیام کیا۔ ہر وقت سینکڑوں کانگرسی ان کے درشن کے لئے جمع رہتے تھے۔ میں نے اور مہر صاحب نے کہلا بھیجا کہ ہم حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ وقت مقرر ہو گیا۔ دوپہر کے وقت ہم باریاب ہوئے۔ مولانا نے مولوی حبیب الرحمن لودھیانوی سے کہہ دیا کہ بس اب کمرے کا دروازہ بند کر دیجئے اور لوگوں سے کہہ دیجئے کہ میں آج کسی سے نہیں ملوں گا۔ ہم حاضر خدمت ہوئے تو مولانا نے چائے کا سروسامان درست کیا۔ اور نہایت محلی بالطبع ہو کر باتیں شروع کیں۔ سالک صاحب آپ کو معلوم ہے عربی میں کھٹائی کو کیا کہتے ہیں۔ میں نے عرض کیا "حموض"۔ کہنے لگے کھٹا کرنا "تحمیض" کہلاتا ہے۔ برے معنی میں نہیں بلکہ چٹپٹا بنانے کے معنی میں ایک عربی قول ہے۔ حمضوا مجالسکم اپنی مجلسوں اور صحبتوں کو چٹپٹا بناؤ۔ تو آپ کے آنے سے ہماری مجلس چٹ پٹی بنی۔ اس کے بعد ترجمان القرآن کی اشاعت۔ اس کے تیسرے حصے کی ترتیب سورہ فاتحہ کی تفسیر کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ مہر صاحب نے سیرت سید احمد شہید کے متعلق کچھ گزارشات پیش کیں۔ بعض امور سے مولانا نے اختلاف کیا مہر صاحب کچھ بگڑے اور کہنے لگے۔ مولانا میں اس قسم کے تمام شبہات و وساوس کا سدباب کر دوں گا۔ میرے پاس مواد بھی ہے اور دلائل بھی۔ فرمایا۔ ہاں میرے بھائی یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ آپ ضرور کوشش کیجئے۔ یہ تو بہت اچھا ہوگا۔

اس موقع پر بعض عقیدت مندوں نے فلیٹی میں ایک ٹی پارٹی کا اہتمام کیا۔ جس میں ہر مذہب و ملت اور ہر عقیدہ سیاسی کے کوئی آٹھ سو اشخاص شریک ہوئے۔ مولوی حبیب الرحمن لودھیانوی مولانا داؤد غزنوی۔ آغا شورش کاشمیری وغیرہ مولانا کے ساتھ بیٹھے تھے۔ احباب کی گزارش پر مولانا نے ۴۵ منٹ تک تقریر کی۔ کمال یہ تھا کہ اس تقریر میں ہندو مسلمان۔ کانگرس۔ لیگ تحریک، پاکستان۔ گاندھی۔ جناح یا اور کسی شخصیت یا ادارے کا نام تک نہیں آیا لیکن مولانا کو جو کچھ کہنا تھا وہ سب کہہ گئے اور لطف یہ ہے کہ کسی کو تقریر کے کسی فقرے سے ناگواری نہیں ہوئی۔ اعتراض کی گنجائش بھی نہیں نکلی بلکہ سب اس خطیب زمانہ کے حسن بیان سے مسحور ہو رہے تھے۔

دہلی میں ملاقات

پاکستان قائم ہونے کے بعد مولانا ایک دو دفعہ کراچی سے ہو کر گزرے لیکن دو روزہ قیام کا کبھی کچھ اتفاق نہیں ہوا۔ مہر صاحب دہلی جا کر ان سے مل آئے۔ اور اپنی کتاب کے متعلق فراہمی مواد اور مشورت میں مستفیض ہوئے۔ اب سے تین سال پہلے میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں دہلی گیا تو سب مولوی اجمل خاں صاحب کے ساتھ حکومت ہند کے وزیر تعلیم کی شاندار کوٹھی کے پُر بہار کمرے طے کرتا ہوا اس گوشے میں پہنچا جہاں مولانا بیٹھے تھے۔ تو دیکھا کچھ لکھ رہے تھے۔ پلیٹ میں رکھے ہیں اور پینے کا سامان بھی موجود ہے۔ علیک سلیک اور بغلگیری کے بعد میں نے پوچھا مولانا۔ یہ بریک فاسٹ ہے یا لنچ۔ سامان کے لحاظ سے ناشتہ معلوم ہوتا ہے اور وقت کے اعتبار سے کھانا۔ آخر یہ کیا ہے۔ بہت شگفتہ ہوئے کہنے لگے "غریب کو جس وقت ملے"۔ میں نے کہا مجھے تو یہ امیر کو جس وقت بھوک لگے کا کیس معلوم ہوتا ہے۔ اس قسم کی ہلکی ہلکی باتیں دیر تک ہوتی رہیں۔ ترجمان القرآن کے متعلق بتایا کہ بمبئی کے ایک مطبع سے فیصلہ ہو گیا ہے وہ چھاپے گا۔ اور تیسری جلد بھی مرتب ہو گئی ہے وہ بھی اسی کے حوالے کی جائے گی پھر خواجہ ناظم الدین اور خواجہ شہاب الدین کی صحت کے متعلق دریافت کیا اور کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد میں نے اجازت چاہی۔

جب میں دوسری دفعہ دہلی گیا تو اس وقت مولانا ایک حادثہ کی وجہ سے زیب بستر علالت تھے میں نے مولوی اجمل خاں صاحب سے حالات دریافت کئے۔ ایسی حالت میں مولانا کو تکلیف دینا مناسب نہیں سمجھا اور مجبوراً بے دیکھے واپس آگیا۔

وضعداری اور لطافت طبع

مولانا کی پابندی وضع اور متانت ملک بھر میں مسلّم ہے۔ غذا و لباس۔ نشست و برخاست۔ تعلقات و روابط۔ انداز و اظہار کی شائستگی سخن طرازی و بذلہ سنجی جو پہلے دن تھی وہی اب تک قائم ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ پاک و ہند میں غالباً کوئی مثال نہیں رکھتے۔ صاف ستھری۔ لطیف اور قلیل غذا کھاتے ہیں۔ گوشت ہو یا سبزی یا دال جب تک صفائی اور لطافت محفوظ ہے مولانا کو ہر شے پسند ہے۔ اگر غذا کے کسی جزو میں بھاری پن یا کثافت نظر آئے تو مولانا اس کو ہاتھ تک نہ لگائیں گے اور روٹی کے چھوٹے چھوٹے چند نوالے کھا کر دسترخوان سے اٹھ جائیں گے۔ میٹھا پسند نہیں۔ نمک پسند ہے اعلیٰ درجے کی چینی چائے پیتے ہیں۔ جس میں دودھ ڈالنا گناہ کبیرہ سے کم نہیں سمجھتے۔

★

مولانا کی زندگی اور کام آنیوالی نسلوں کیلئے سرچشمۂ فیضان رہیگا

گورنر راجستھان گورمکھ نہال سنگھ

گورنر راجستھان سردار گورمکھ نہال سنگھ نے "ایشیا" کے آزاد ایڈیشن کے لئے اپنا پیغام ایڈیٹر "ایشیا" میر مشتاق احمد کے نام اپنے حسب ذیل مکتوب میں روانہ فرمایا ہے۔

راج بھون

جے پور

۳ رفروری ۱۹۶۱ء

جناب میر مشتاق احمد

مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد کی برسی پر شائع ہونے والے "ایشیا" کے خصوصی شمارے کے سلسلہ میں مجھے آپ کا ۲ فروری کا مکتوب ملا۔

مولانا آزاد کا نام نامی ہمارے ملک کی تاریخ میں نہ صرف اپنی آن وطنی خدمات کے لئے زندہ جاوید ہو گیا ہے جو انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں انجام دیں بلکہ نئے ہندوستان کی تعمیر کے سلسلہ میں بھی ان کی زندگی اور کام آنے والی نسلوں کے لئے سرچشمہ فیضان رہے گا۔

مجھے امید ہے کہ یہ خصوصی شمارہ قبولیت عام حاصل کرے گا۔ بہترین خواہشات کے ساتھ۔

آپ کا مخلص
گورمکھ نہال سنگھ

مولانا ... (مرحوم)

مولانا آزاد کی زندگی کی چند جھلکیاں

جس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد ابھی بے ریش و بروت انسان تھے اور نوعمری کے باوجود علم و فضل اور لسانی و طراری کے اعتبار سے اپنے ہمسوں اور معصروں سے کوسوں آگے تھے بمبئی میں آغا حشر ابو نصر آہ اور نظیر حسن تمنا کے ساتھ عیسائیوں اور آریوں سے مناظرے کیا کرتے تھے اور اپنے اہتمام سے ایک ماہانہ رسالہ "بلاغ" بھی نکالتے تھے۔ مناظروں کے سلسلے میں انہیں مرزا غلام احمد قادیانی کی بعض ایسی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوا جن میں عیسائیوں اور آریوں کے مقابلے میں اسلام کی حمایت کی گئی تھی۔ یاروں کا یہ مجمع ایک دفعہ تو فیصلہ ہی کر چکا تھا کہ پنجاب جائیں اور مرزا صاحب سے ملیں۔ لیکن اتفاقات زمانہ کی وجہ سے یہ فیصلہ عمل میں نہ آسکا۔ بہر حال مولانا ابوالکلام مرزا صاحب کے دعوائے مسیحیت موعود سے تو کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ لیکن ان کی غیرت اسلام اور حمیت دینی کے قدردان ضرور تھے۔

ابوالکلام اور الہلال

مولانا شبلی نوعمر ابوالکلام آزاد کی علمیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے "الندوہ" کی ادارت انہیں سونپ دی مولانا کی نوعمری کی وجہ سے اکثر بزرگوں کو یقین نہ آتا تھا کہ جو فاضل جلیل "الندوہ" میں مضامین لکھتا ہے وہی لڑکا ہے بلکہ مولانا حالی تو ایک دفعہ مولانا ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام آزاد کا صاحبزادہ سمجھ بیٹھے تھے اور بعد میں بجد حیرت اور ندامت کا اظہار کیا تھا موجودہ صدی کے عشرۂ دوم کے آغاز میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ اور ان کا صحیفہ الہلال اس شان و شوکت سے خطابت و صحافت کے افق پر جلوہ گر ہوئے کہ ملک کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں مسلمانوں کو اس سے پیشتر نہ تو ایسے روشن طبع۔ طباع و طرار اور ادیب و خطیب عالم دین کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور نہ ایسا اخبار ہی کبھی جاری ہوا تھا جو اعلیٰ درجہ کے کاغذ پر نسخ ٹائپ میں۔ باتصویر اور بہترین مغربی ٹھاٹھ سے منصۂ شہود پر آیا ہو۔ علوم و السنہ مشرقیہ کے شیدائی۔ ادب و انشا کی خوبیوں کے رسیا اور مسلمانوں میں حیات ملی کے احیا کے آرزومند پروانہ وار ٹوٹ ٹوٹ کر الہلال اور ابوالکلام پر گرے اور دو ہفتوں کے اندر ہی ان کا شہرہ ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچ گیا مجھے اعتراف ہے کہ مجھے لکھنے پڑھنے کا ذوق شوق بخشنے اور جذبات کے اعتبار سے پر جوش مسلمان بنانے میں علامہ اقبال کی نظم اور ابوالکلام آزاد کی نثر نے سب سے بڑا حصہ لیا ہے۔ میں ان دونوں کے اثرات خامہ کا مطالعہ نہایت پابندی سے کرتا رہا۔ اور مولانا نے تو میرے نام الہلال اعزازی طور پر جاری کر رکھا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں مولانا لاہور آئے اور بعض نوجوانوں نے جہاد پر ان سے بیعت کی جن میں ہمارے مہر صاحب بھی شامل تھے اور اس زمانے میں پڑھتے تھے۔ موچی دروازہ کے باہر باغ میں ہزارہا کا مجمع ہوا جس میں مولانا نے ایک بے نظیر تقریر کی بے ریش و بروت سرخ و سفید چہرہ۔ بڑی بڑی سحر گر آنکھیں حرکات و سکنات شیریں اور سنجیدہ خطابت کے کمالات اور زبان و ادب کے محاسن ان سب نے مل کر مجمع کو مسحور کر رکھا تھا۔ اور مولانا سے میری شیفتگی اور فریفتگی کی تو کوئی حد نہ تھی۔

رانچی میں خط و کتابت

چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی "اتحاد عالم اسلامی" کی تحریک کے بڑے کارکنوں میں شمار کئے جاتے تھے اس لئے جنگ عظیم اول میں جہاں محمد علی شوکت علی ظفر علی مقید و پابند کر دیئے گئے وہاں مولانا ابوالکلام بھی رانچی (بہار) میں نظر بند ہو گئے اور جو آفتاب شدہ ہدایت کلکتہ کے افق سے سارے ملک میں تجلیاں بکھیر رہا تھا صرف رانچی کے مسلمانوں کے لئے وقف ہو گیا جنھوں نے اس نعمت غیر مترقبہ سے بے حد استفادہ کیا میں ان دنوں تہذیب نسواں اور پھول کا اڈیٹر تھا ایک خاتون نے "فسخ نکاح زوجہ معلقہ" کا مسئلہ تہذیب نسواں میں چھیڑا۔ اس پر ایک صاحب نے اخبار "وکیل" امرتسر میں تلخ سا مقالہ لکھدیا جس کا جواب میں نے "وکیل" ہی میں دیا۔ اس سے چند روز بعد ایک دن دفعتہً مولانا ابوالکلام کا ایک خط میرے نام آیا جس میں میرے مضمون کی تعریف کی تھی۔ اور مسئلے کے چند پہلو بھی واضح کئے تھے۔ میں نے اس خط کا جواب دیا تو مولانا نے لکھا کہ آپ کی استعداد سے زیادہ آپ کے حسن خط کا اثر مجھ پر ہوا میرا خیال ہے کہ جس شخص کا خط اچھا ہو اس کی فطرت میں بھی کوئی نہ کوئی حسن پوشیدہ ہے۔ آپ اپنے مزید حالات لکھئے میں نے حالات لکھدیئے۔ اس پر مولانا نے لکھا کہ کوئی پچاس ہزار دستخطوں سے ایک محضر گورنر بنگال کو بھیجا گیا ہے۔ جس میں میری رہائی کا مطالبہ کیا گیا ہے غالباً میں عنقریب رانچی کی نظر بندی سے رہا کر دیا جاؤں گا آپ الہلال میں کام کریں وجہ معاش کی فکر نہ کیجئے۔ جو کچھ آپ کو لاہور میں ملتا ہے وہ مع اس اضافہ کے جو کلکتہ کی گرانی مصارف کی بنا پر ضروری ہوگا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا۔

خط و کتابت جاری رہی اور میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ کیونکہ مجھے اس شخص نے رفاقت تحریر کے لئے منتخب کیا تھا جس کو آغاز الہلال ہی سے میں نے انتہائی احترام اور مرعوبیت سے دیکھا تھا میں سوچتا تھا کہ اگرچند سال مولانا کے ساتھ بسر ہو گئے اور میں نے ان سے قرآن حکیم سمجھ لیا تو دینی و دنیاوی برکات کا خزانہ سمٹ کر میرے قبضہ میں آجائے گا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، گورنر نے محضر کو نامنظور کر دیا۔ اور مولانا بدستور نظر بند رہے۔

مولانا لاہور میں

اس کے بعد مولانا اس زمانے میں لاہور تشریف لائے جب تحریک خلافت ختم ہو چکی تھی۔ شدھی سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کا دور تھا۔ مولانا موٹر کار میں امرتسر سے لاہور پہنچے ہیں اور مہر صاحب بھی استقبال کرنے والوں میں شامل تھے۔ سالہا سال کے بعد میں نے مولانا کی زیارت کی اب گلوں پر ہلکی ہلکی داڑھی بہار دے رہی تھی۔ میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لا کے دولت کدہ پر قیام ہوا ہر سیاسی عقیدے کے مسلمان اکابر جمع ہوئے۔ جن سے مولانا نے مسلمانوں کی سیاست پر گفتگو کی اور کانگرسی ہندو لیڈروں اور کارکنوں سے بھی ملاقاتیں کیں منصوبہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو سیاسی ہم آہنگی پیدا ہو چکی ہے اسے فرقہ وار تحریکوں سے برباد نہ ہونے دیا جائے کلکتہ سے "البلاغ" جاری ہوا پھر الہلال ٹائپ کے بجائے لیتھو میں چھپنے لگا۔ اگرچہ اب اس کی افادی حیثیت بڑھ گئی تھی۔ لیکن چونکہ جوش و خروش کا زمانہ گذر چکا تھا اس لئے وہ جذبات انگیز انشا پردازی مفقود تھی جس کی توقع نوجوانوں کو الہلال سے تھی۔

ٹرین میں ملاقات

جن دنوں ملک کے مختلف صوبوں میں کانگرسی وزارتیں قائم ہو رہی تھیں مولانا ابوالکلام ترتیب وزارت کے لئے صوبہ سرحد تشریف

مولانا آزاد کا کردار ہماری تاریخ کا زریں باب ہے

وزیر اعظم جموں و کشمیر جناب بخشی غلام محمد کا پیغام

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ "ایشیا" ویکلی دہلی مولانا آزاد کے یوم وفات کے موقع پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے۔

ملک کی آزادی کی جدوجہد میں مولانا آزاد کا کردار اور اس کے بعد استحکام و تعمیر نو میں حصہ ہمیشہ ہمارے ملک کی تاریخ کا ایک زریں باب رہے گا۔ اُن کی پرزور اور مستقل مزاجی سے مسائل کی سیکولر نقطہ نظر سے وکالت اور جس طرح سے انھوں نے دو قوموں کی مکروہ تھیوری کی مخالفت کی ہمارے ملک کی تاریخی دستاویزوں میں زریں حروف سے لکھی جائے گی۔ یہ ایک المیہ ہے کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے اور ملک قبل از وقت ان کی قابل رہنمائی اور دانشمندانہ مشوروں سے محروم ہو گیا۔

آج جب ملک ان کا یوم وفات منا رہا ہے میں اپنے لاکھوں ہم وطنوں کا شریک ہو کر ان کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ ہم اُس راستے پر ثابت قدمی سے قائم رہیں جو ہم نے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔

...بناوٹ سے بھی اپنے آپ کو نیک نہیں بنا سکتا۔ اگر انسانی زندگی کی سعادت کے لئے اس عملی صداقت کی کچھ بھی ضرورت ہے جسے نیکی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے تو ناگزیر ہے کہ عام انسانی سطح سے کوئی بلند تر ذریعہ ارشاد و ہدایت کا ہو۔ مذہب اور الہام اسی ذریعۂ ہدایت کا نام ہے۔

(ابوالکلام آزاد)

نئی سوسائٹی میں مذہب کا مق

(الہلال کا ایک آرٹیکل)

انسان ذہن و جسم کی کتنی ہی عظمتیں حاصل کرلے لیکن روح اور اخلاق کی ادنیٰ سے ادنیٰ پاکیزگی بھی حاصل نہیں کرسکتا اگر اس کا اعتقاد اور عمل روحانی ہدایت کی روشنی سے محروم ہے۔ انسان کے لئے یہ سہل ہے کہ تمام دنیا فتح کرلے سکندر نے تمام دنیا کی سلطنتیں تہہ و بالا کر ڈالی تھیں۔ انسان کے لئے یہ بھی مشکل نہیں کہ ذہن و فکر کی ایسی بلندیوں تک پہنچ جائے جہاں تک دوسروں کے قدم نہ پہنچے ہوں۔

ارسطو، اقلیدس، سولن اور سنیکا جیسے فاتحین علم کی فتحمندیاں لازوال ہو چکی ہیں۔ اور دنیا منطق، ریاضی، قانون اور فلسفۂ اخلاق میں آجتک ان کے پس رو ہے۔ انسان کی اولوالعزمی ان بلندیوں پر بھی نہیں رکی کچھ مشکل نہیں اگر وہ آگ کے شعلوں میں کود پڑے سمندر کی موجوں کی ہنسی اڑائے پہاڑوں کی صفیں چیر ڈالے مگر ہاں یہ مشکل ہی بہت ہی مشکل کہ وہ اخلاق اور روحانی پاکیزگی کی راہ میں اپنی ایک کسی خواہش نفس کا بھی مقابلہ کرسکے اس کی ساری اولوالعزمی اور کوہ ہمتی جو دنیا کی ساری رکاوٹوں کا تن تنہا مقابلہ کرسکتی ہے ہوائے نفس کی ایک ادنیٰ سی رکاوٹ بھی اپنی راہ سے ہٹا دینے پر قادر نہیں ہوتی۔

سکندر تمام دنیا کی تسخیر کی محنت سے نہیں تھکا۔ لیکن بابل کی ایک عورت جب اس کے سامنے آئی تو اپنی خواہش نفس کے اضطراب سے بے بس ہو کر گر گیا۔ سینیکا نے تمام نوع انسانی کو اخلاق اور اخلاقی سعادت کی دعوت دی لیکن خود اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کی منکوحہ عورت سے باز نہ رکھ سکا ارسطو کے دامن علم کے جتنے بھی دنیا اگن چکی ہے۔ فی الحقیقت انسانی زندگی کی یہی اخلاقی اور عملی نامرادی ہے جو الہامی ہدایت کی کسی بالاتر قوت کو تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

انسان اپنے ذہن و جسم کی قوتوں سے سب کچھ کرسکتا ہے لیکن تکلف اور

الاصلاح والافساد

دنیا عالم کون و فساد ہے۔ اس میں ایک چیز بنتی ہے تو دوسری بگڑتی ہے ایک چراغ بجھتا ہے تو دوسرا جلتا ہے۔ کلیوں کے دہن تنگ کا نقشہ بگڑ جاتا ہے تب پھولوں کا شگفتہ چہرہ متبسم ہوتا ہے۔ قطرہ اپنی صورت بدل دیتا ہے تب موتی اپنی آب و تاب دکھاتا ہے۔ سیاہی اپنی روانی کھو دیتی ہے تب صفحۂ قرطاس پر ایک نقش ثابت جلوہ آرا ہوتا ہے۔ یہ ابدی قانون ہے ہمیشہ سے جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گا۔

(البلاغ)

تاریخ کا فیصلہ

تاریخ کی زبان کوئی بند نہیں کرسکتا اور وہ جو سبق دیتی ہے وہ حرف ایک قسم کا ہے۔ دنیا میں بہت سی شخصیتیں ایسی ہیں جنہیں انسان پاتا ہے اور ماننے کے لئے مجبور ہوتا ہے تاہم ان کی صداؤں کو سننا پسند نہیں کرتا چاہتا ہے کہ لوگوں کی زبان سے ان کو سنے لیکن ایک وقت آتا ہے کہ وہ ان سب حقیقتوں کی آواز سننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور زبان سے اٹھی ہوئی صدائیں نہیں بلکہ واقعات کے ہجوم سے پیدا شدہ طاقتیں اس کے کانوں کو کھڑکی بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج کی طرح سب کچھ سنا دیتی ہیں۔

(ابوالکلام آزاد)

مجھے ۱۹۲۰ء سے قومی کام میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ وابستہ رہنے کا فخر حاصل رہا ہے۔ اسلام کے بارے میں ان سے زیادہ معلومات کسی اور کو حاصل نہیں ہیں۔ عربی زبان کے وہ بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کی دیش بھگتی اسی طرح پختہ اور راسخ ہے جس طرح ان کا اسلام میں عقیدہ۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس کے اعلیٰ ترین سردار ہیں اور ہندوستانی سیاسیات کا مطالعہ کرنے والے ہر ایک شخص کو چاہیئے کہ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرے۔

مہاتما گاندھی

ہفتہ وار ایشیا کی معلومات

فارم نمبر ۴ (قاعدہ ۸ کے مطابق)

(۱) مقام اشاعت .... اردو ہال اردو بازار دہلی
(۲) مدت اشاعت .... ہفتہ وار
(۳) پرنٹر کا نام .... میر مشتاق احمد
قومیت .... ہندوستانی
پتہ .... اردو ہال اردو بازار دہلی
(۴) ناشر کا نام .... میر مشتاق احمد
قومیت .... ہندوستانی
پتہ .... اردو ہال اردو بازار دہلی
(۵) ایڈیٹر کا نام .... میر مشتاق احمد
قومیت .... ہندوستانی
پتہ .... اردو ہال اردو بازار دہلی
(۶) مالک .... میر مشتاق احمد

میں بیان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا معلومات صحیح ہیں۔

میر مشتاق احمد
22—2—61

اس کی عربیت " بھی مولانا سے پہلے جو انشاء کے اچھے لکھنے والے تھے انہوں نے اپنے ادبی انشا میں زور۔ رنگینی اور دلکشی پیدا کرنے کے لئے ہمیشہ فارسی کا سہارا لیا۔ نظم کے میدان میں سودا میر غالب اور انیس کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ نثر میں رجب علی سرور۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ منشی قمرالدین وغیرہ قابل ذکر ہیں مولانا عبدالحلیم شرر کے دلگداز میں بھی جدید ادب لطیف کے نمونے ملتے ہیں مگر سب میں فارسیت غالب ہے۔

علامہ شبلی نے البتہ نثر میں عربی کے الفاظ کچھ زیادہ استعمال کئے۔ مگر پھر بھی اسی حد تک جیسے دال میں نمک۔ مولانا پہلے شخص ہیں جن کی اردو تحریر میں عربیت کا طوفان امنڈتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے زمین و آسمان، اس کی فضا اس آب و ہوا، سب عربی ہے۔ لیکن مولانا نے یہ عربیت بہ تکلف نہیں پیدا کی۔ ان کی تحریریں سراپا آمد کا نمونہ ہیں کہیں آورد کا نام ونشان نہیں معلوم ہوتا۔ اصل میں مولانا کی مادری زبان عربی تھی۔ پھر ممالک عربیہ میں قیام و سیر و سیاحت نے اس پر اور جلا کر دی تھی۔ اردو مولانا کی پدری زبان تھی اس لئے مولانا جب اردو لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کے قلم سے عربی الفاظ بے تکلف نکلتے جاتے تھے۔ مولانا کی عربیت کے سلسلہ میں ایک لطیفہ بیان کیا جاتا ہے۔ زندگی کے آخری دور میں جب مولانا نے بہ ضرورت اپنی زبان کو ہندی سے قریب تر لانے کے لئے سہل بنانا شروع کیا۔ جب بھی ان کی زبان سے ثقیل عربی الفاظ نکل جاتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر ایسا ہی ہوا۔ ایک صاحب شریک بزم مولانا سے بے تکلف تھے انہوں نے ٹوک دیا اس پر مولانا بھول اٹھے کہ معاف کیجئے "ذہول" ہوگیا۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ مولانا کی تحریر میں اتنا زور صرف عربیت ہی کی وجہ سے تھا غلط ہے۔ مولانا فارسی اور اردو ادب کے بھی بڑے ماہر تھے اور شعر و ادب کا بڑا بلند ذوق رکھتے تھے اپنی تحریر میں وہ اردو کے کمتر اور فارسی کے اشعار بیشتر اس طرح لے آتے تھے جیسے انگوٹھی میں نگینہ جڑ دیا جاتا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی تحریر میں ہی زور پیدا ہوجاتا تھا بلکہ خود شعر بھی چمک جاتا تھا۔ مولانا کو فارسی اساتذہ کے شعر کثرت سے یاد تھے۔ مولانا کے پسندیدہ عموماً حافظ، نظیری، عرفی، فیضی وغیرہ تھے اردو شعراء کے کلام پر بھی ان کی کافی نظر تھی۔ تغزل جو شعر و شاعری کی جان ہے اس کی نسبت سے وہ پوری طرح آشنا تھے۔ اس وجہ سے ان کی نثر میں اکثر شعر بلکہ تغزل کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ نثر میں شاعری کرتے تھے۔ جب ہی مولانا حسرت موہانی چلا اٹھے ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

غرض مولانا کا عربی فارسی اور اردو میں تبحر اور تینوں زبانوں کے ادب لطیف کا ذوق، یہ چیز تھی جس نے مولانا کی تحریر کو اس قدر رنگین اور دلکش بنادیا تھا۔ یوں تو الہلال کے اجراء کے بعد اردو صحافت کی دنیا ہی بدل گئی اور ہر صحافی مولانا کے رنگ میں لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر اس میں کامیابی کم ہی لوگوں کو ہوئی اور مولانا نیاز فتحپوری نے مولانا ابوالکلام کے طرز انشاء کو اچھی طرح اپنایا مگر چونکہ ان کا موضوع مذہب و سیاست کے بجائے عشق و رومان ہوگیا اس لئے ان کے کلام میں رنگینی تو بہت آگئی مگر مولانا کا سا زور پیدا نہیں ہوسکا مولانا کے ہاتھوں میں آکر اردو صحافت کا دور طفلی ختم ہوگیا۔ یہ اپنی جوانی کے عالم میں آگئی اور اس میں غضب کی رعنائی پیدا ہوگئی۔

مولانا کی تحریر میں بلا کا زور بیان اور جوش و خروش ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے اردو زبان میں کیا دنیا کی بہت سی زبانوں میں پر زور اور پر جوش تحریریں نہیں ملیں گی۔ الہلال کے پڑھنے والے تھوڑی دیر کے لئے ایسے سرمست اور بیخود ہوجاتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسری دنیا میں جاکر کھو گئے۔ اور جب یہ نشہ کم ہو بھی جاتا تھا جب بھی مولانا کی تحریر کی لذت دیر تک کام و دہن کو محسوس ہوتی رہتی تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مولانا الفاظ کے بڑے جادوگر تھے۔ انہیں اس میں کمال تھا کہ ایسے الفاظ اور ترکیبیں اپنی تحریر میں استعمال کریں جن کا اثر مسحور کن ہو۔ ان کے کلام کا اثر اور جوش و خروش بس صرف الفاظ کا جادو تھا راقم کو ان حضرات کے خیال سے اتفاق نہیں ہے جب تک لکھنے والے کے دل میں کوئی کیفیت نہ ہو، صرف الفاظ کی جادوگری سے دوسروں کے قلوب کو متاثر نہیں کرسکتا۔ یہ ایک کلیہ ہے جس کے مستثنیات بہت مشکل سے ملیں گے۔ وہ پرانی مثل کہ "از دل خیزد و بر دل ریزد" اپنی جگہ بالکل صحیح ہے۔ مولانا کی پر زور اور پر جوش تحریریں یقیناً ان کی قلبی کیفیت کی آئینہ دار ہوتی تھیں وہ جو کچھ دل میں محسوس کرتے تھے وہی ان کی زبان و قلم سے الہلال کے صفحوں پر مترشح ہوتا تھا۔ ان کے لفظ لفظ سے ان کے دلی خلوص کا پتہ چلتا تھا۔ ان کی نقل کرنے والوں نے بہت سے ذی علم لوگ بھی تھے مگر ان کے قلوب اس کیفیت سے خالی تھے۔ اس لئے ان کے کلام میں وہ تاثیر پیدا نہیں ہوسکی۔ الہلال کی تحریروں نے پڑھنے والوں کے اندر ایک بڑا ذہنی انقلاب پیدا کردیا تھا۔ اس انقلاب نے کوئی زبردست عملی تحریک نہیں پیدا کی۔ اس کے کچھ خاص وجوہ ہیں۔ مولانا کی مذہبی اور سیاسی تحریک کس حد تک کامیاب ہوئی اور کس حیثیت سے ناکام۔ یہ اس مقالہ کے موضوع سے خارج ہے۔ انشاءاللہ کسی دوسری صحبت میں اس پر روشنی ڈالی جائیگی

مولانا کی تحریر کی متانت و جزالت اور اور اس کا خطیبانہ زور تو بے مثل تھا ہی۔ مگر کبھی موقعہ آجاتا تھا تو مولانا کا قلم طنز و تعریض کے جوہر بھی خوب دکھاتا تھا۔

الہلال کے زمانہ میں مولانا عبدالماجد دریا بادی جو اس وقت مسٹر عبدالماجد تھے اردو میں فلسفہ اور نفسیات کی اصطلاحیں وضع کرنے میں مصروف تھے۔ اسی موضوع پر ایک مضمون انہوں نے الہلال میں بھی چھپوایا اس میں انگریزی اصطلاحات پلیزر (pleasure) اور پین (Pain) کے لئے اردو اصطلاحیں "حظ" و "کرب" تجویز کی تھیں۔ مولانا نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ہمارے یہاں پہلے سے "لذت" و "الم" کی اصطلاحیں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ عرصہ تک گرما گرم بحث رہی اور مولانا نے مسٹر عبدالماجد کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اور قارئین الہلال کو بہت لطف اندوزی کا موقعہ دیا۔ غرض کوئی موضوع ہو مذہبی یا سیاسی، علمی یا ادبی مولانا کا قلم ہر جگہ اپنی جولانیاں دکھاتا تھا اور الہلال کے اجراء کے تھوڑے ہی دنوں کے اندر مولانا کی تحریر کی دھاک موافق اور مخالف سب کے دلوں میں بیٹھ گئی۔ اور قلمرو صحافت میں انہیں کا سکہ و خطبہ جاری ہوگیا۔

● مسٹر مہادیو ڈیسائی نے جو مہاتما گاندھی کے پرائیویٹ سکریٹری تھے۔ مولانا ابوالکلام پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے موصوف کہتے ہیں

● مولانا کی شخصیت میں اتنا جذب اور کشش ہے کہ آپ کی ہر جگہ تعظیم کی جاتی ہے مگر آپ ان لیڈروں میں سے نہیں جن تک سفور رسائی حاصل ہو جاتی ہے، اور جو ہر شخص سے ملتے ہیں اور شہرت حاصل کرتے ہیں۔ کانگرس کے معاملات میں مولانا کی حیثیت ہمیشہ یکتا رہی ہے۔ انھیں سالہا سال سے یہی حیثیت حاصل ہے اور رہے گی۔ مگر اس کے باوجود آپ ہمیشہ اس قسم کے عہدے قبول کرنے سے بھاگتے ہیں۔ آپ اگر چاہتے تو کسی صوبائی اسمبلی یا مرکزی اسمبلی میں پارٹی لیڈر بن سکتے تھے، مگر آپ ہمیشہ صاف بچ کر نکل جاتے رہے، آنجہانی سی۔ آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو آپ کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتے تھے مگر آپ نے ہمیشہ نمائش اور ہنگامے کی جگہ مشیر ہونے کو ترجیح دی۔

● ہندوستان کے مشہور قوم پرور رہنما مسٹر آصف علی نے مولانا آزاد پر ایک مقالہ میں لکھا ہے

مولانا بڑی سختی و مضبوطی کے ساتھ اسلام کی قدیم روایات اور پرانے اصولوں پر قائم ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت نہیں جو اُن کے قدم ڈگمگا سکے۔ اُن کے پیش نظر رسول عربی کی بلند مثال ہے۔

مولانا آزاد کی علمی موشگافیاں

بیگم اور خانم

صاحبہ اور صاحب:۔ "بیگم صاحبہ" میں "صاحبہ" ثقات کے طرز تکلم کے خلاف ہے، صرف بیگم ہونا چاہیئے علاوہ بریں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دلی کے ثقات کبھی بیگم "صاحبہ" نہیں کہتے تھے۔ بیگم صاحب کہتے تھے اور یہی کانوں کو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ "صاحبہ" مولویوں نے اظہار عربیت کے لئے لکھنا شروع کیا، اور اب بہت سے لوگ جو اہل زبان کے دقائق سے بے خبر ہیں، لکھنے لگے ہیں، آپ اس سے احتراز کریں۔

"بیگم صاحبہ" پنجاب اور پورب کی بول چال ہے ثقات دہلی کی زبان "بیگم صاحب" ہے۔

بیوی اور بیگم:۔ یہاں اوّل تو بیگم کی جگہ "بیوی" لکھنا تھا کیونکہ عنوان کا مقصد یہ تھا کہ شوہر کے اپنی بیوی سے محبت رکھتا ہے، یعنی بیوی ہونا چاہیئے، نہ کہ بیوی کا تعظیمی لقب، پھر بیگم لکھا تھا تو اس کے ساتھ کچھ اور نہیں لکھنا تھا، بیگم سے محبت گویا بیگم کو آپ نے بیوی کے مجرّد معنوں میں لے لیا۔

خانم:۔ "مسز" کی جگہ عام طور پر "بیگم" بولنا حال کا استعمال ہے، پہلے بیگم صرف امراء کی بیویوں کے لئے مخصوص تھا۔ متوسط طبقہ کے شرفاء میں "بیگم" سے بیویوں کو مخاطب نہیں کرتے تھے۔ البتہ "خانم" کا استعمال عام تھا، نام کے جزو کی حیثیت سے بھی جیسے زہرا خانم اور عوام کے معنوں میں بھی جیسے مرزا صاحب کے یہاں سے خانم کی سواری آئی ہے، یاد رکھیئے یہ بھی خانم "صاحبہ" نہیں ہے "صاحب" ہے، گویا "بیگم" انگریزی کے "لیڈی" کی جگہ تھا "مسز" کی جگہ نہ تھا۔

مسز کا صحیح بدل:۔ آج کل جب لوگوں کو "مسز" کی جگہ کسی موزوں لفظ کی جستجو ہوئی تو بیگم کا لفظ سامنے آگیا۔ اور عام طور پر بولا جانے لگا، اب چونکہ زبانوں نے قبول کرلیا ہے تو ٹھیک ہے چلنے دیا جائے، ورنہ ویسے مسز کے لئے بیگم سے زیادہ موزوں "خانم" تھا "بیگم" کو "لیڈی" کی جگہ رہنے دیا جاتا آج کل اس قدر کثرت سے استعمال کیا جارہا ہے، پھر بھی امارت کی اس قدر تیز بو اس میں بس گئی تھی، کہ اب بھی سونگھی جاسکتی ہے!

دراصل "لیڈی" کی طرح "بیگم" بھی فیوڈل عہد کے امتیازات کی یادگار ہے، جمہوریت و عمومیت کی ترویج کے ساتھ ایسے ملقب جمع نہیں ہوسکتے۔

(میر مشتاق احمد پرنٹر پبلشر نے یونین پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر ہفتہ وار "ایشیا" اردو بازار دہلی سے شائع کیا) (مالک میر مشتاق احمد)

مزاجِ ابوالکلام

مولانا آزاد کے مزاج عادات، طریقہ کار اوقات کار، میل جول، رکھ رکھاؤ کے بارے میں ہر شخص کا جداگانہ مغالطہ ہے۔ مثلاً پنڈت نہرو کا خیال ہے وہ بے حد شرمیلے اور خلوت پسند ہیں اور مزید براں ان کے پہلو میں ایک حساس دل ہے با وجود ایک مؤثر اور باوقار مقرر ہونے کے شور وشغب اور ہنگامہ خیزیوں سے بہت گھبراتے ہیں — اگر اس قدر خلوت پسندی اور شرمیلا پن ان کی طبیعت کا خاصہ نہ ہوتا تو وہ ملکی اور قومی کاموں میں اس سے بھی بڑھ کر حصہ لیتے۔ کیونکہ ان کے قلم میں ایک سحر اور ان کے لبوں میں ایک اعجاز ہے جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکت وعمل کی طرف راغب کرسکتا ہے۔

آصف علی صاحب لکھتے ہیں: "مولانا ایک حساس دل اور عقاب تیز نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی ذہانت تلوار کے جوہر اور برلہ سنجی خنجر کی کاٹ رکھتی ہے۔ مردم شناسی مولانا کا ایک خاص وصف ہے لیکن خود اس طرح کٹ کے رہتے ہیں کہ لوگوں کے بارے میں آسانی کے ساتھ کوئی رائے قائم نہیں کرسکتے۔"

اور یہ صحیح بھی ہے کہ مولانا کے بارے میں آسانی سے کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی اس لئے ہم نے ان کی تحریروں پر کچھ اقتباسات پیش کئے ہیں۔ آپ ان کے مزاج کو ان کی تحریروں کے آئینے میں دیکھئے۔ (ادارہ)

بچپن میں شوق مطالعہ

لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں۔ مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوئر ضرور دیکھا ہوگا جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے۔ اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے اس میں درختوں کا ایک جھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھئے تو درخت ہی درخت ہیں اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بنچ بھی بچھی ہوئی ہے معلوم نہیں اب بھی یہ جھنڈ ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لئے نکلتا تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہوجاتا۔ والد مرحوم کے خادم ... مجھے ساتھ لے جایا کرتے تھے وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجھلا کر کہتے "اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی تو گھر سے نکلا کیوں؟"

کھیل کود سے نفرت

کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کن شہر تھا۔ لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رغبت ہی نہیں کرتی تھی۔

والد مرحوم میرے اس شوق علم سے خوش ہوتے مگر فرماتے کہ یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ دے گا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری۔ مگر دل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی نہ سنبھل سکا۔

(غبار خاطر مکتوب ۲۹ اگست ۱۹۴۲ء)

عادت سحر خیزی

زندانیوں کے اس قافلہ میں کوئی نہیں جو سحر خیزی کے معاملے میں میرا شریک حال ہو۔ سب بے خبر سو رہے ہیں اور اسی وقت میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں:

دائم گسستہ قافلہ بود ست پاسباں
بیدار شو کہ چشم رفیقاں بخواب شد

سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا کی الٹی ہی چال میرے حصے میں آئی۔ دنیا کے لئے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہے وہی میرے لئے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے

لذت یاب ہوتا رہوں۔

ایک بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ دل کی انگیٹھی ہمیشہ گرم رہنے لگی۔ صبح کی اس مہلت میں تھوڑی سی آگ جو سلگ جاتی ہے اس کی چنگاریاں بجھنے نہیں پاتیں۔ راکھ کے تلے دبی دبائی کام کرتی رہتی ہیں۔

(غبار خاطر مکتوب ۱۵ اگست ۱۹۴۲ء)

جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جاسکتے اس لئے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے — — —

(غبار خاطر مکتوب ۲۹ اگست ۱۹۴۲ء)

فلسفہ سے دلچسپی

طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی بھی برابر بڑھتی گئی۔ لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ عملی زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے میں فلسفے سے کچھ زیادہ مدد نہیں مل سکتی .... فلسفہ تمہیں کلیلہ و دمنہ (پنچ تنتر) کی دانش آموز چڑیا کی طرح نصیحت کرے گا لا تتاسف علی مافات جو کچھ کھو چکا اس پر افسوس نہ کر لیکن کیا اس کھونے کے ساتھ کچھ پانا بھی ہے اس بارے میں وہ ہمیں کچھ نہیں بتلاتا کیونکہ بتلا سکتا ہی نہیں اور اس لئے زندگی کی تلخیاں گوارا کرنے کے لئے صرف اس کا سہارا کافی نہ ہوا۔

(غبار خاطر مکتوب ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء)

موروثی عقائد کی چھان بین

عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثہ کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا ہے لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔ میری پیاس اس سے زیادہ نکلی جتنی سیرابی وہ دے سکتے تھے مجھے پرانی راہوں سے نکل کر خود اپنی راہیں ڈھونڈنی پڑیں۔ زندگی کے ابھی پندرہ برس بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ طبیعت نئی خلشوں اور نئی جستجوؤں سے آشنا ہوگئی تھی اور موروثی عقائد جس شکل و صورت میں سامنے آکھڑے ہوئے تھے ان کے مطمئن ہونے سے انکار کرنے لگی تھی۔

(غبار خاطر مکتوب ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء)

زندگی پر کنٹرول

مجھے اپنی زندگی کی دو قسمیں کردینی پڑیں ایک قید خانے سے باہر کی — ایک اندر کی۔ قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد

تنہائی پسند زندگی

ابتدا ہی سے طبیعت کی رفتار کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور

دل نہیں سکتا اور خود مشغول مزاج پریشانی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا بزم و انجمن کے لئے بار خاطر نہیں رہتا۔ لیکن یار شاطر بھی بہ تکلم بن سکتا ہوں۔

لیکن جوں ہی خیالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یکسر بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں کہ خالی ہوگئے تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور از سر نو آراستہ کردوں۔

(غبار خاطر مکتوب ۱۲ اگست ۱۹۴۲ء)

ترک عادت

۱۹۲۱ء میں جب مجھے گرفتار کیا گیا تو مجھے معلوم تھا کہ قید خانہ میں تمباکو کے استعمال کی اجازت نہیں۔ مکان سے جب چلنے لگا تو ٹیبل پر سگریٹ کیس دھرا تھا عادت کے زیر اثر بے اختیار ہاتھ بڑھا کر اسے جیب میں رکھ لوں پھر صورت حال کا احساس ہوا تو رک گیا۔ لیکن پولیس کمشنر نے جو گرفتاری کا وارنٹ لے کر آیا تھا۔ بہ اصرار کہا ضرور جیب میں رکھ لو۔ میں نے رکھ لیا اس میں دس سگریٹ تھے ایک کمشنر پولیس کے آفس میں پیا۔ دوسرا راستہ میں سلگایا۔ دو سات کو پیش کئے چھ باقی رہ گئے کہ پریسیڈنسی جیل پہنچا جیل کے دفتر سے جب اندر جانے لگا تو خیال ہوا کہ اس جیب کے وبال سے سبک جیب ہوکر اندر قدم رکھوں تو بہتر ہے میں نے کیس نکالا اور پھر اس دن سے لے کر دو برس تک سگریٹ کے ذائقہ سے کام و دہن آشنا نہیں ہوا۔

(غبار خاطر مکتوب ۳ ستمبر ۱۹۴۲ء)

دل و دماغ پر قید کا اثر

جب کبھی اس طرح کا معاملہ یکایک پیش آجاتا ہے تو ابتدا میں اس کی سختیاں پوری طرح محسوس نہیں ہوتیں کیونکہ طبیعت میں مقاومت کا ایک سخت جذبہ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ صورت حال سے دب جائے وہ اس کا غالبانہ مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ علائق کا فوری انقطاع کاروباری زندگی کی بڑی مشغولیتوں کا یک قلم تعطل کوئی بات بھی دامن دل کو کھینچ نہ سکی کلکتہ سے باطمینان تمام نکلا اور رانچی میں شہر کے باہر ایک غیر آباد حصہ میں مقیم ہوگیا۔ لیکن پھر جوں جوں دن گزرتے گئے طبیعت کی بے پروائیاں جواب دینے لگیں اور صورت حال کا ایک ایک کانٹا پہلو کے دل میں چبھنے لگا۔

آپ کی فرصت کے لمحات کی بہترین ساتھی

گرانقدر علمی، ادبی، مذہبی، تاریخی اور سیاسی و فنی کتابیں!

مذہبی

- انوار تصوف 1/-
- اصل بلا بدعت 1/50
- آداب مساجد -/31
- اسلامی کتب کامل 1/50
- صحیح بخاری شریف اردو 8/-
- " مسلم " " 10/-
- موطا امام مالک " 6/-
- انتخاب صحاح ستہ 5/-
- اسلام زندہ باد 1/-
- اسلام میں دستور کی تلاش -/44
- اسلام کا اقتصادی نظام مجلد 6/50
- اخلاق اور فلسفۂ اخلاق مجلد 7/50
- اسلام کا نظام مساجد 4/50
- مشکوٰۃ شریف اردو 18/-
- ترمذی شریف 15/-
- معجزات خیر الانام 3/-
- دینی ضروریات 2/-
- اسلام کی بہادر بیٹیاں -/50
- آمنہ کا لال 1/50
- امت کی مائیں 2/50
- اصلاح الرسوم 1/25
- اسلامی معاشرت 1/25
- اسلام میں پردہ کی حقیقت -/37
- اسلام کا نظام عفت و عصمت 5/-
- اسلام کا زرعی نظام 5/-
- العلم والعلماء 5/50
- الفوز الکبیر فی اصول التفسیر 1/-
- اسلامی تحریک کے مجاہد 1/75
- ایک اسلام 4/-
- اللہ کی عادت 4/-
- اسلام کا نظام حکومت مجلد 7/-
- اعمال قرآنی 1/25
- ارکان اسلام 1/50
- اسلام تلوار سے نہیں پھیلا -/75
- ارشادات سالکین 1/25
- پہلی تقریر سیرت 1/75
- دوسری " 2/50
- پردے کی باتیں 1/55
- پیارے نبی 1/-
- پردہ 2/50
- تعلیم الدین 2/-
- تحفۃ القرآن 1/50
- تعلیمات اسلام 2/50
- تاریخ الامت اول 2/50
- " دوم 3/25
- " سوم 2/-
- " چہارم 2/25
- تجلیات کعبہ 3/-
- تجلیات مدینہ 2/50
- تبلیغی چالیس سبق -/25
- تاریخ اسلام 5/-
- ترجمان السنہ مکمل مجلد 25/-
- تاریخ مشائخ چشت 13/-
- تاریخ ملت کامل مجلد 32/-
- تاریخ اسلام پر ایک نظر 6/50
- تذکرہ شیخ محمد بن طاہر محدث 1/-
- تدوین قرآن 1/50

- [illegible] احمد سعید 2/25
- تفسیر سورہ یوسف 1/25
- " یونس 1/45
- " کہف و مریم 1/50
- " بنی اسرائیل 1/50
- " انبیاء و حج 1/25
- " اعراف 1/25
- تاریخ علم فقہ 2/25
- جہان نو 3/-
- جواہر القرآن 2/50
- جنت کی کنجی 3/25
- حبیب خدا 4/50
- حیات المسلمین 1/75
- حکایات صحابہ 1/50
- خلفائے اسلام کے شاندار کارنامے 6/25
- خدا کی باتیں 2/75
- خلفائے راشدین 1/50
- دین حق 1/-
- دو اسلام 3/75
- دو قرآن 3/75
- دوزخ کس کیلئے؟ 3/25
- دوزخ کا کھٹکا 2/25
- دین کی باتیں 3/75
- دینیات 3/50
- دین خالص -/50
- رکن دین 2/-
- رسول اللہ کے معجزے 1/25
- روحانی اقوال 1/50
- رسول اللہ کی صاحبزادیاں 1/-
- رحمت عالم 1/75
- رسول پاک کے طریقے -/50
- رسول اللہ کی بیویاں 1/25
- رسول پاک 1/75
- رہنمائے قرآن 1/-
- رسول اللہ کی باتیں 2/25
- رسول اللہ 1/25
- رحمت کا دربار -/12
- سلاطین عباسیہ 1/-
- سیرت رسول 2/-
- سیدہ کی بیٹی 3/-
- سیرت خاتم الانبیاء 1/50
- سچے رسول کی سچی کہانی 2/50
- سیرت فخر دو عالم 2/-
- سچی باتیں 3/87
- سیرت النعمان 2/-
- سوانح قاسمی مکمل 12/-
- سیرت النبی کامل 49/50
- سیر الصحابہ کامل 47/50
- عثمان 5/50
- علمائے ہند کا شاندار ماضی 5/50
- علوم عربیہ غیر مسلموں کی نظر میں 1/50
- عہد اسلامی کا ہندوستان 6/50
- عورت اور اسلامی تعلیم 3/-

- عرب اور اسلام 4/50
- علمائے حق کامل 2/25
- غلامان اسلام 6/50
- فضائل رمضان -/44
- فضائل تبلیغ -/31
- فضائل نماز -/50
- فضائل قرآن مجید -/49
- فضائل ذکر -/44
- فضائل صدقات اول و دوم 3/87
- فضائل امت محمدیہ -/50
- فہم قرآنی 3/25
- قرآن کی تعلیمات 3/-
- قانون مکافات 1/-
- قصص القرآن مکمل 25/50
- قرآن اور [illegible] 2/-
- قرآن اور تعمیر سیرت 6/-
- قرآن اور تصوف 3/-
- مکتوبات معارف 2/25
- مضامین مولانا احمد سعید 2/-
- مسلمانوں کا عروج و زوال 5/-
- مشکل کشا 2/25
- ماہ رمضان 1/50
- مکمل لغات القرآن 24/-
- مسلمانوں کا نظام مملکت 5/-
- مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ 1/50
- مسلم خواتین کیلئے بیس سبق -/75
- نکات قرآن 2/-
- وحی الٰہی 4/-
- ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک 2/50
- ہندوستان پر مغلیہ حکومت 5/50
- ہزاروں سال پہلے 4/50
- ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تربیت 5/-
- ہند و پاک کے اولیاء 2/50
- ہفت سورہ 1/50

روحانیت و تصوف

- تاریخ الاولیاء 2/-
- سیرت غوث الاعظم 3/-
- روحانیت کے چوبیس ستارے 2/-
- واقعات الصالحین 2/-
- سیرت باقی 3/-
- خطبات غوثیہ 4/-
- خواجہ غریب نواز 3/-
- خواجہ بختیار کاکی 3/50
- بابا فرید گنج شکر 3/50
- روحانیت کے تاجدار 2/50
- نعمت ربانی 1/-
- تجلیات نعت 3/-
- بادۂ عرفان 3/-
- تذکرۃ الابرار 2/-
- تنبیہ الغافلین 3/-
- تصوف اقبال 3/-
- معین العارفین 3/-

- حضرت رابعہ بصری 1/-
- اعمال تسخیر القلوب 1/-
- جواہر غوث الوریٰ 2/-
- مخدوم صابر کلیری 3/50
- حیات حلیمہ 2/50
- بیاض الاولیاء 3/-
- روح تصوف 3/-
- غیبی آواز 3/-

تاریخ و سیاست

- اہنسا تک انقلاب کا راستہ -/25
- آزادی کی نئی وسعتیں 1/-
- بالوا اور مزدور -/50
- پاکستان میں مزدور تحریک -/37
- ترجمہ سفرنامہ یورپ 1/75
- تاریخ دیوبند 2/-
- جواہر لال کی کہانی 5/-
- جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات کامل 14/50
- چلئے کے پانچوں میں مزدور عورتیں -/25
- دنیا کے مشہور سائنسداں 2/25
- درس سیاست -/50
- دکن کی سیاسی تاریخ 2/50
- روس کا سوشلسٹ انقلاب -/21
- روسی دستاویز 1/25
- ریاست اور انقلاب 2/-
- سیاسیات کا اصول 5/-
- سیاسی نظریے 1/-
- سر جگدیش چندر بوس 2/-
- خالد بن ولید 3/-
- عالمگیر 1/-
- صلاح الدین ایوبی 3/50
- مجاہدین اسلام 2/-
- سیرۃ الرسول 2/-
- خاتون جنت 1/50
- حسین 3/-
- مظلوم کربلا 3/-
- سیدہ فاطمۃ الکبریٰ 1/-
- شیطان کی سوانح عمری 2/25
- تاریخ الانبیاء 1/25
- جنات کے پراسرار حالات 3/50
- سرخ پوش کسان -/62
- سیر کشمیر 1/25
- سوشلزم 1/25
- سیاست کی پہلی کتاب -/50
- سویت روس 1/75
- کسان کی پکار -/50
- کانگریس خطرے میں 1/-
- کمیونسٹ اور مذہب 1/75
- عالمی سیاست میں جمہوریت 1/75
- گاندھی جی 5/-
- گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں 5/-

- قرون وسطیٰ میں کیا دیکھا 1/25
- کارل مارکس ہندوستان میں 1/25
- کشمیر جنت نظیر 2/50
- مارکس اور اس کے معتقدات -/75
- ممالک اسلامیہ کی سیاست 2/50
- مشاہیر چین 1/50
- مسئلہ آبادی -/37
- مرد انقلاب -/75
- مغلوں کا مرد [illegible] -/50
- عائشہ صدیقہ 1/25
- حیات صدیق 2/50
- عشرہ مبشرہ 3/-
- محمود غزنوی 2/-
- مسلمانوں کی داستان شجاعت 2/-
- سیرت خلفائے راشدین 2/-
- ملک عنبر 1/50
- ماؤزے تنگ 1/25
- مارشل ٹیٹو 2/50
- نیا چین 1/50
- ہمارے زمانہ کی غلامی -/75
- ہند و مسلم ایکتا -/75

مولانا آزاد کی کتابیں

- عیدین 1/50
- دعوت حق 1/50
- قول فیصل 2/50
- تحریک آزادی 3/50
- غبار خاطر 6/-
- تذکرہ 7/-
- شہید اعظم 1/50
- مسلمان اور کانگریس 1/25
- میرا عقیدہ 1/50
- صبح امید 6/-
- خطبات آزاد 3/-
- ملفوظات آزاد 2/50

خواتین کے لئے

- اقبال دلہن 2/-
- ایلسے 1/50
- اصلاح معاشرت 1/50
- آمنہ کا لال 1/50
- انشائے بشیر 1/75
- آپ کا بچہ 3/-
- بچوں سے دو دو باتیں 1/25
- بنات النعش 2/50
- باپ کا خط بیٹی کے نام 1/-
- بہشتی زیور مکمل 16/-
- بیگم کشیدہ کاری 1/-
- باورچی خانہ -/62
- بیسویں صدی کی کشیدہ کاری 3/-
- توبۃ النصوح 2/50

- تکیہ کے اشعار 2/-
- چمن کشیدہ کاری 2/-
- حور کشیدہ کاری -/50
- حمیدی دسترخوان 3/-
- خانہ داری بیگم 2/50
- دلہن کشیدہ کاری 2/50
- رضیہ کا شاہی دسترخوان 2/50
- رشیدہ کی کشیدہ کاری 3/50
- رائل کشیدہ کاری 2/-
- زینت کشیدہ کاری 5/50
- سیدہ کی بیٹی 3/25
- شمع کشیدہ کاری 4/50
- فائن ٹیلر ماسٹر 1/50
- قمر کشیدہ کاری 4/-
- قدسیہ کشیدہ کاری 1/-
- کامیاب درزی خانہ 2/-
- گل بدن بیگم 4/-
- گلشن کشیدہ کاری 2/-
- مراۃ العروس 2/50
- محصنات 2/50
- محفل خواتین 3/-
- ماڈرن کشیدہ کاری 3/50
- نگار کشیدہ کاری 1/50
- نرگس کشیدہ کاری 1/50
- شبنم کشیدہ کاری 1/-
- حسین کشیدہ کاری 2/50
- ریحانہ کا شاہی دسترخوان 2/-

صنعت و حرفت (ٹیکنیکل)

- انجکشن بک 3/-
- ایلوپیتھک ٹریٹمنٹ 5/-
- بوٹ پالش سازی 2/50
- بغیر بجلی کا ریڈیو 1/-
- پریکٹیکل آرمیچر 2/-
- تجارتی مرغی خانہ 2/-
- تین علاج 2/50
- دولت کمانے کے ڈھنگ 2/50
- رہنمائے بجلی 1/50
- رہنمائے فوٹوگرافی 1/-
- ریڈیو ریسیور 3/-
- سائیکل ریپیرنگ گائیڈ 2/50
- سائنٹفک ایڈورٹائزنگ 2/-
- صنعت میں دولت 5/-
- صنعت و حرفت کے پوشیدہ راز 3/-
- طبیب مرغی خانہ 2/-
- کامیاب مرغی خانہ 3/-
- [illegible] بیکری 2/-
- گھر کا حکیم 4/-
- مویشی اور ان کی بیماری کا علاج 2/-
- ماڈرن الیکٹرک ویلڈنگ گائیڈ 2/50
- موٹر ڈرائیور 1/-
- مکمل فوٹوگرافی 1/25
- معاون ورکشاپ 1/50
- ہدایت نامہ مویشیان 2/50
- فوٹوگرافی گائیڈ 1/-
- اردو ہندی ڈکشنری 10/-
- اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری 14/-

پتہ: مکتبہ ایشیا، اردو بازار دہلی ۶

محصول ڈاک بذمہ خریدار

گیانی گورمکھ سنگھ مسافر ممبر پارلیمنٹ

ہمہ صفت موصوف آزاد

ابھی مولانا صاحب کی کوٹھی سے آکر چارپائی پر دراز ہوا ہی تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ڈاکٹر جوشی جو کچھ کہنا چاہتے تھے کانوں سے پہلے ہی دل سننے پر مجبور ہو گیا۔ فروری ۱۹۵۸ء کی ۲۲ تاریخ صبح دو بجکر پندرہ منٹ جب میں واپس پہنچا تو بخشی غلام محمد پریشانی کی حالت میں باہر کھڑے تھے، سوچتے ہونگے کہ اگر انسان کے بس میں ہوتا تو وہ کیا کچھ نہ کر دیتے اس عظیم ہستی کے لئے۔ پاس ہی کھڑے طارق نے مجھے دیکھ کر کہا: "مسافر جی آیئے دیکھئے وہ پڑے ہیں مولانا آزاد" کہنے کا انداز ایسا تھا کہ آنکھیں دل کا راز فاش کرنے پر مجبور ہو گئیں، مغموم مسٹر مسعود سرہانے بیٹھے تھے۔

۱۸ فروری کی شام مولانا خلاف معمول دیر تک کانگرس پارلیمنٹری پارٹی کی میٹنگ میں بیٹھے رہے:—

شری ٹی۔ ٹی کرشنم چاری کا معاملہ زیر بحث تھا جب میٹنگ سے آ رہے تھے، اپنے خاص انداز میں جھومتے جھامتے چلتے ہوئے میرے پاس سے گذرے مجھے وہم گمان تک نہ تھا کہ سنٹرل ہال میں یہ اُن کے آخری قدم ہیں۔

ادبی علمیت سے سیاست کا بہت کم لگاؤ ہے اس لحاظ سے مولانا ایک واحد شخصیت تھے۔ اُن کا ایک ہی نقطۂ نظر تھا جس کی وضاحت اُنہوں نے اپنی تقریر سے تحریر سے اور عمل سے کی وہ صحیح معنوں میں عالم باعمل تھے۔ آزادیٔ وطن کے لئے جیل کی قید و بند الگ بات ہے۔ دیش کے لئے اہم اور نازک وقت وہ تھا جب یورپی سیاستدانوں کے ساتھ ضروری مسائل پر باتیں ہو رہی تھیں، ویول کانفرنس وغیرہ، مولانا اس وقت کانگرس کے صدر تھے۔ زیادہ بوجھ ان گتھیوں کو سلجھانے کا آپ ہی کے کندھوں پر تھا۔ خاص کر اس حالت میں جب کہ دوسری طرف فرقہ وارانہ جماعتیں رہنمائی کا دم بھر رہی تھیں۔ اور ایک طرح سے نیلام پر کھڑی تھیں، یہ مولانا کی قابلیت، دور اندیشی اور سب سے زیادہ وطن پرستی ہی تھی۔ جس نے دنیا بھر میں مولانا کا نام روشن کیا۔ اور دنیا کے سامنے یہ بات روشن ہو گئی کہ ایک مشرقی عالم سیاستدان کسی طرح بھی بیسویں صدی کے مغربی سیاستدان سے کم درجہ نہیں تھا۔

عالم و فاضل، مولانا اسلام پر بھی ایک اتھارٹی مانے جاتے تھے۔ اس لئے آپ کے عمل نے اسلام کی اصلی خوبصورتی کو عوام کے سامنے زیادہ نمایاں کیا۔ راقم الحروف کو تقسیم ملک سے بہت پہلے سے مولانا صاحب کے قدموں میں بیٹھنے کا فخر حاصل ہے پہلے دور دور سے پھر نزدیک سے اور پھر بہت نزدیک سے۔ پنجاب کے معاملات میں وہ زیادہ دلچسپی لیتے تھے اس لئے زیادہ تر میرا واسطہ بطور صدر پنجاب کانگرس اُن سے رہتا تھا۔ معاملہ فہمی میں وہ یکتا تھے۔ بہت جلدی بات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ کوئی بات نہ ماننی ہو تو صاف صاف کہہ دیتے تھے "میرے بھائی! انتظار کرو" انتظار کے بعد اُنھیں خود ہی یاد ہوتا تھا کہ اب یہ کام مجھے کرنا ہے۔ پچھلے جنرل چناؤ میں اُنہوں نے پنجاب کے ضلع گوڑگاؤں سے پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر ہمارے صوبہ کو خاص فخر بخشا۔ وہ سارے ہندوستان کے ہی محبوب تھے مرکز میں اُن کے پنجاب کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے ہمیں بہت فائدہ پہنچا۔ جب کبھی بھی مجھے اُن سے ملنے کا اتفاق ہوتا، ادبی تذکرے ضرور شروع ہو جاتے۔ جب وہ ہمیں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے ہیں۔ اس سے کچھ ہی دن پہلے میں ملنے گیا تو اُن کی میز پر جوش ملسیانی کی ایک کتاب پڑی تھی، کچھ شعروں پر نشان بھی لگے ہوئے تھے جس میں ایک شعر تھا۔

> موت ہی انسان کی دشمن نہیں،
> زندگی بھی جان لے کر جائے گی۔

مجھے یاد ہے کہ امرتسر کانگرس سیشن میں جب میں اپنا استقبالیہ خطبہ پڑھنے لگا۔ تو فرمانے لگے "مسافر صاحب اپنا ایڈریس نظم میں ہی پڑھو۔ لوگ سُن کر ہنس پڑے۔ میں نے مولانا صاحب کی خوشنودی اور توجہ کیلئے اپنے خطبہ کے ساتھ کچھ رباعیاں زبانی جوڑ لیں جس سے اجلاس میں کچھ خاص فضا پیدا ہو گئی۔ اجلاس کے بعد آپ نے ایک بڑا اچھا سرٹیفکیٹ لکھ کر بھیجا۔

جواہر لال جی کا مولانا صاحب کے مشوروں پر کتنا کچھ انحصار رہا یہ میرے کہنے کی بات نہیں کانگرس ورکنگ کمیٹی میں مولانا زیر بحث سوالوں کے بارے میں پوری تیاری کر کے بیٹھتے تھے۔ تقریباً ہر ایک مسئلہ پر وہ صاف رائے دیتے وہ اکثر مانی جاتی۔

مولانا کی نرینہ اولاد نہیں ہے۔ مگر اندازہ نہیں ہو سکتا کہ اُن کے چلے جانے پر کتنے لوگ اپنے آپ کو یتیم سمجھنے لگے۔ جائیداد اُنہوں نے نہ کوئی بنائی اور نہ چھوڑی۔ گورو گرنتھ صاحب میں آتا ہے۔ "جیسے جل میں کنول الیپ" یعنی کنول پھول پانی میں رہتا ہوا بھی پانی سے باہر رہتا ہے۔ ایک چوٹی کے سیاستدان، دنیاوی لحاظ سے بھی ایک بڑی بھاری شخصیت، کروڑوں دلوں کے مالک نے اپنی ذات خاص کے ساتھ دو کوڑی کی جائیداد کو بھی منسوب نہیں کیا، موجودہ زمانہ میں کیا یہ کوئی کم بات ہے۔

مولانا کی کس بات کو اس چھوٹے سے مضمون میں لکھوں اور کس کو چھوڑ دوں میرے لئے تو کچھ لکھنے کی جرأت کرنا ہی گستاخی ہے، مگر دل کی لش کو ٹالنا بھی گستاخی ہی سمجھا جاتا۔ مولانا سراپا ایک زندگی تھے۔

> چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
> اب فقط آواز ہی آواز ہے

بقیہ — کانگرس کی رہنمائی سے آگے

اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو جانے پر کانگرس وزارتیں مستعفی ہو گئیں اور اختلاف کی وجہ یہ ہوئی کہ وائسرائے نے ہندوستان کی طرف سے جنگ میں شرکت کا اعلان کر دینے پر کانگرسی وزارتوں نے اختلاف کرتے ہوئے استعفے دیدیا۔ اس نازک موقعہ پر گاندھی جی نے مولانا آزاد سے کانگرس کی صدارت سنبھالنے کو کہا جس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں کہ—

میں نے یہ محسوس کیا کہ اب معاملہ دوسری نوعیت کا ہے اس لئے اگر اب انکار کروں گا تو میں اپنے فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کروں گا میں جنگ میں شرکت کے سوال پر گاندھی جی سے ۴

موعظت و ذکریٰ

"اگر پانی کہے کہ یہ میری کارفرمائی ہے۔ تو آفتاب بھی چمک سکتا ہے۔ کہ یہ اس کی حرارت کا معجزہ ہے۔ اگر دہقان مدعی ہو کہ اُس نے بیج ڈالا تو موسم اُسے جھٹلا سکتا ہے کہ بغیر میرے آئے ہوئے محض تخم ریزی کیا کر سکتی تھی۔ مزدوروں نے ہل جوتا۔ کاشتکار نے بیج ڈالا۔ نگہبانوں نے رکھوالی کی اور موسم نے آبپاشی اور ان میں سے ہر فریق دعویٰ کر سکتا ہے۔ کہ میں ہی اس لہلہاتے ہوئے کھیت کی وجود پذیری کی علت ہوں ...... مگر...... وہ جو اِن سب سے بالاتر قوت ہے کہتی ہے کہ تم سب ہیچ ہو۔ اگر قدرت الٰہی تمام اسباب و وسائل مہیا نہ کرتی تو نہ بیج بارآور ہوتا اور نہ ایک سبز پتہ زمین پر نظر آتا۔ "الہلال" فروری ۱۹۱۴ء

۴ پہلے ہی اختلاف ظاہر کر چکا تھا میرا یہ خیال تھا کہ جبکہ جنگ شروع ہو گئی ہے ہندوستان کو جمہوری طاقتوں کا ساتھ دینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے۔

وابستہ تجھ سے عظمتِ ہندوستاں رہی

از:- پروفیسر تلوک چند محروم

> گاندھی کے بعد ہند میں مینارِ روشنی — تھی تیری ایک ذات جو طلعت فشاں رہی
> جانے سے تیرے آہ اندھیرا سا چھا گیا — آزاد اب وہ نور کی بارش کہاں رہی
> ہاتھوں میں تھا ترے علمِ اتحادِ ہند — سائے میں جس کے قوم بہ امن و اماں رہی
> توڑا طلسم جس نے فریبِ فرنگ کا — تیری رفاقت اس کیلئے حرزِ جاں رہی
> برسا کیا جو مینہ ترے فضل و کمال کا — شاخِ امید اہلِ وطن گل فشاں رہی
> ہندوستاں کے مشرق و مغرب میں بار رہا — وابستہ تجھ سے عظمتِ ہندوستاں رہی
> نقشِ دوام بن گئی تحریرِ دل نشیں — تقریر تیری حاملِ حسنِ بیاں رہی
> خاک اُڑ رہی ہے آج کنگ ایڈورڈ روڈ پر — جو آب و تاب میں صفتِ کہکشاں رہی
> ایامِ فصلِ گل میں تو ہم سے جدا ہوا — گویا بہار اب کے بھی اپنی خزاں رہی
> آزاد ہو کے بھی نہ ہوئے غم سے ہم رہا — اپنے لئے وہی روشِ آسماں رہی
> محروم ابتدا سے ہمارے نصیب میں
> نوحہ گری رہی وہی طرزِ فغاں رہی

یہی وقت تھا جب مجھے اپنی طبیعت کی اسی افتاد ... سے مقابلہ کرنا پڑا اور ایک ... کا ... نتیجہ اس کے سنے ڈھالنا پڑا۔ اس وقت ... کے آج تک چھبیس برس گزر چکے ... کام دے رہا ہے اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ ٹوٹ جا سکتا ہے ... نہیں کہا سکتا۔

حسرتوں کے کانٹے

کوئی اپنا دامن پھولوں سے بھرنا چاہتا ہے کوئی کانٹوں سے اور دونوں میں سے کوئی بھی پسند نہیں کرے گا کہ تہی دامن رہے۔ جب لوگ کامرانیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چن رہے تھے تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے

انہوں نے پھول چن لئے اور کانٹے چھوڑ دیئے
ہم نے کانٹے چن لئے اور پھول چھوڑ دیئے۔

(غبار خاطر مکتوب ۱۱ ... ۱۹۴۳ء)

قوت حافظہ

معلوم نہیں، ایک خاص طرح کے ذہنی وارد کی حالت کا آپ کو تجربہ ہوا ہے یا نہیں؛ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات برسوں تک حافظہ میں تازہ نہیں ہوتی۔ گویا کسی کونے میں سو رہی ہے۔ پھر کسی وقت یکایک اس طرح جاگ اٹھے گی، جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہیں۔ تیس چالیس برس پیشتر کے مطالعہ کے نقوش کبھی اچانک اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہو گا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے ساتھ کتاب یاد آجاتی ہے۔ کتاب کے جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحہ کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا یا درمیانی سطروں میں یا آخری سطروں میں۔ نیز صفحہ کا رخ کہ داہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ حسب معمول سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا۔

کہ لاتم و قیمتم افزوں زشمارست
گوئی ثمر بیشتر از باغ وجودم

مکتوب ۱۱ اگست ۱۹۴۳ء غبار خاطر

پسندیدہ انتخاب

بازار میں ہمیشہ وہی جنس رکھی جاتی ہے جس کی مانگ ہوتی ہے اور چونکہ مانگ ہوتی ہے اس لئے ہر ہاتھ اس کی طرف اٹھتا ہے اور ہر آنکھ اسے قبول کرتی ہے مگر میرا معاملہ اس سے بالکل الٹا رہا۔ جس جنس کی کبھی عام مانگ ہوئی، میری دکان میں جگہ نہ پاسکی۔ لوگ زمانہ کے معمہ بازار میں ایسی چیزیں ڈھونڈ کر لائیں گے جن کا رواج عام ہو۔ میں نے ہمیشہ ایسی جنس ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کی جس کا کہیں رواج نہ ہو۔ اوروں کے لئے پسند و انتخاب کی جو علت ہوئی وہی میرے لئے ترک و اعتراض کی علت بن گئی۔ انھوں نے دکانوں میں ایسا سامان سجایا جس کے لئے سب کے ہاتھ بڑھیں۔ میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں جس کے لئے سب کے ہاتھ بڑھ سکیں۔

قماش دست زد شہر وہ زمن مطلب
متاع من ہمہ ویرانی سرت یا ثانی

لوگ بازار میں دکان لگاتے ہیں تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگاتے ہیں جہاں خریداروں کی بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دکان لگائی تو ایسی جگہ ڈھونڈ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گزر ہو سکے۔

در کوئے ماشکستہ دلی می خوند ولبس
بازار خود فروشی ازاں سوئے دیگرست

مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔

با رفیقان زخود رفتہ سفر دست نہ داد
سیر صحرائے جنوں ... کہ تنہا کردیم

جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہو گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔

آں نیست کہ من ہم نفساں را بگزارم
با آبلہ پایاں چہ کنم؟ قافلہ تیز است؟

اس تیز رفتاری سے تلووں میں چھالے پڑ گئے لیکن عجب نہیں راہ کے کچھ خس و خاشاک صاف بھی ہو گئے ہوں!

خارہا از گرمی رفتارم سوخت
منتے بر قدم راہروان ست مرا

غبار خاطر مکتوب ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۳ء

عادات وخصائل

جہاں تک طبیعت کی سیرت اور عادات وخصائل کا تعلق ہے، میں اپنی خاندانی اور نسلی وراثت سے بے خبر نہیں ہوں۔ ہر انسان کی اخلاقی اور معاشرتی ... کا قالب نسل و خاندان کی مٹی سے بنتا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ میری عادات وخصائل کی مورتی بھی اسی مٹی سے بنی۔ ہر خاندان اپنی زندگی کی ایک انفرادیت پیدا کر لیتا ہے، اور وہ نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی ہے۔ میں صاف محسوس کرتا ہوں کہ اس روائتی زندگی کے اثرات میرے ضمیر میں رچ گئے ہیں اور میں ان کی پکڑ سے باہر نہیں جا سکتا میری عادات وخصائل، چال ڈھال، طور طریقہ امیال و اذواق سب کے اندر خاندان کا ہاتھ صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یہ خاندانی زندگی کی روائتیں مجھے میرے ددھیال اور ننھیال دونوں سلسلوں سے ملیں۔ اور دونوں پر صدیوں کی قدامت اور تسلسل کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ وہ بہرحال میرے حصے میں آتی تھیں ان کے قبول کرنے یا نہ کرنے میں میری خواہش اور پسند کو کوئی دخل نہ تھا لیکن یہاں سوال عادات وخصائل کا نہیں ہے افکار و عقائد کا ہے اور جب اس اعتبار سے اپنی حالت کا جائزہ لیتا ہوں تو خاندان، تعلیم، ابتدائی گرد و پیش، کوئی گوشہ بھی میل کھاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ فکری موثرات کے جتنے بھی احوال و ظروف (ENVIRONMENTS) ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک ایک کو اپنے سامنے لاتا ہوں اور ان میں اپنے آپ کو ڈھونڈھتا ہوں مگر مجھے اپنا سراغ کہیں نہیں ملتا۔ میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے بزرگوں کو اپنے سامنے پایا جو عقائد و افکار میں اپنا ایک خاص مسلک رکھتے تھے اور اس درجہ سخت اور بے لچک تھے کہ بال برابر بھی ادھر ادھر ہونا کفر و زندقہ تصور کرتے تھے۔ میں نے بچپن سے اپنے خاندان کی جو روائتیں سنیں، وہ بھی سرتا سر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں اور میرا داغی ورثہ اس تصلب اور جمود سے بوجھل تھا۔ میری تعلیم ایسے گرد و پیش میں ہوئی۔ جو چاروں طرف سے قدامت پرستی اور تقلید کی چار دیواری میں گھرا ہوتا ہے۔ اور باہر کی مخالف ہواؤں کا وہاں گزر نہ تھا۔ والد مرحوم کے علاوہ جن اساتذہ سے تحصیل کا اتفاق ہوا، وہ بھی وہی تھے جنہیں والد مرحوم نے پہلے اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا کہ ان کے معیار عقائد و فکر پر پورے پورے اتر سکتے ہیں اور یہ معیار اس درجہ تنگ اور سخت تھا کہ ان کے معاصروں میں سے خال خال اشخاص ہی کی وہاں تک رسائی ہو سکتی تھی۔ پس ظاہر ہے کہ اس دروازے سے کبھی کسی نئی ہوا کے گزرنے کا امکان نہ تھا۔ جہاں تک زمانے کے فکری انقلابات کا تعلق ہے میرے خاندان کی دنیا وقت کی راہوں سے اس درجہ دور واقع ہوئی تھی کہ ان راہوں کی کوئی صدا وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اور اس اعتبار سے گویا سو برس پہلے کے ہندوستان میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی صحبتوں کو انسانی دماغ کا سانچا ڈھالنے میں بہت دخل ہوتا ہے لیکن ... سوسائٹی ... چار دیواری کے ... اور گھر کے عزیزوں اور بزرگوں کے علاوہ اگر کوئی دوسرا گروہ ملا بھی تو وہ خاندان کے معتقدوں اور مریدوں کا گروہ تھا وہ میرے ہاتھ پاؤں چومتے اور ہاتھ باندھے کھڑے رہتے

مولانا ابوالکلام آزاد

پروفیسر محمد اجمل خاں

گفتی نیست کہ با غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نداشت

یہ شعر صرف مولانا مرحوم ہی پر صادق نہیں آتا بلکہ ہر خدا پرست اور قوم پرور ہندوستانی پر صادق آتا ہے۔ ہر اس ہندوستانی پر جس نے "تعمیر ہندوستان" کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ متحدہ ہند ہی نہیں بلکہ اتحاد عالم کا نغمہ گایا تھا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا؟ تقسیم ہند۔

تاریخیں لکھی جائیں گی۔ اور ماضی کی غلطیوں کو ٹٹولیں گی۔ مرثیے ہوں یا قصیدے سب کا ٹیپ کا بند مندرجہ بالا شعر ہوگا۔

مرثیہ لکھنے والے اپنے آنسوؤں سے پرچے سے اپنے اپنے وطن عزیز کے سیم جاں ٹکڑوں پر نظر ڈالیں گے۔ اور دیکھیں گے۔ کہ گدھوں اور کتوں کو موقع مل گیا ہے کہ موت سے پہلے انہیں ہڑپ کر جائیں۔ قصیدہ گو اپنے مردار خود آقاؤں کی تعریف کے پل باندھیں گے۔ کہ ان سے گزر کر وہ بھی پس خوردہ کھا لیں۔

لیکن ان سے قریب کچھ روحیں۔ گاندھی۔ سبھاش۔ حسرت اور آزاد کی روحوں سے سرگوشیاں کرتی نظر آئیں گی۔ اور شاید کہہ رہی ہوں گی۔ کہ ہندوستان بہت سمٹ جاتی ہے۔ اور گوتم بدھ سے شنکراچاریہ تک۔ کبیر سے گورو نانک۔ شیخ فرید دادو اور میرا بائی تک۔ ٹیپو سلطان سے تانتیا توپی اور شاہ احمد اللہ تک یہ پیغام پہنچ رہا ہوگا۔ کہ آؤ۔ ہم ہندوستان میں امن و اتحاد پیدا کر کے دنیا کے لئے نمونہ بنا دیں۔ وہ کہہ رہے ہوں گے۔ کہ خود غرضی اور خود پرستی کا سبق سب کو دے ڈوبے گا سب سو لیتی کل دنیا کو بلکہ کل کائنات کو۔

لوگو! تمہارے سمندروں میں آتا چھپا ہے کہ کل دنیا ہی نہیں بلکہ تین چار سو دوسری دنیائیں بھی اندر تک اپنا پیٹ بھر سکتی ہیں۔ تمہارے صحراؤں اور ریگستانوں میں اتنی معدنی دبی پڑی ہے کہ کل کائنات کو لپیٹ سکتی ہے۔ پھر کیوں نہ سب مل کر اس دولت لاانتہا سے فائدہ اٹھائیں۔ کیوں نہ محبت و اخلاص کے گیت گائیں۔ کیوں نہ نفرت کے موت تک قلب انسانیت کی روشنی پہنچائیں۔ اور گل ہی کو نہیں خار کو بھی پیغام بہار سنا دیں۔ کہ

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز
کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

مولانا آزاد کی خطابت کا تاریخی شاہکار

مولانا آزاد کے ایک دیرینہ رفیق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے ایک کتاب ذکرِ آزاد لکھی تھی جو چھپنے سے قبل مولانا ملیح آبادی کی وفات کے بعد شائع ہوئی یہ تقریریں ان کی کتاب میں شائع ہوئی ہے یہاں اُسکے چند اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔ یہ تقریر اخبارات میں لفظ بہ لفظ نہیں ملے گی۔

.... ادارہ

افتتاحی تقریر

حضرات! آپ کے صوبے کی غالباً یہ تیسری مجلسِ خلافت ہے، جس کی صدارت کی خدمت کے لئے آپ نے ازراہِ لطف و نوازش مجھکو منتخب فرمایا ہے۔ میں اِس لطف و عنایت کے لئے آپ تمام بزرگوں اور عزیزوں کا تہِ دل سے شکرگذار ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ اِس خدمت کے انجام دینے میں آپ عزیزوں کی مساعدت میری مدد کرے گی اور اللہ تعالیٰ توفیق دے گا کہ اِس کو بہتر اُمیدوں کے ساتھ ختم کروں۔

آپ سمجھتے ہیں کہ اِس دُنیا میں جس طرح خدا کی سچائی کے مختلف بھیس ہیں خدا کی سچائی کے لئے مختلف نقاب ہیں۔ اگرچہ بھیس مختلف ہوتے ہیں لیکن صورت مختلف نہیں ہوتی۔ اُسی طرح سچائی کی بھی مختلف زبانیں ہیں اور سچائی ہمیشہ اُن مختلف زبانوں سے اپنی فصاحت و بلاغت آپ کے کانوں تک پہنچاتی ہے۔

میں آپ کو یاد دِلانا چاہتا ہوں کہ سچائی کی زبان ایک تو وہ ہے جس کا تعلق ہماری آپ کی خدا کی دی ہوئی گویائی سے ہے، جو زبان سے تعلق رکھتی ہے، وہ آواز جو حلق سے نکلتی ہے۔ ایک گویائی تو وہ ہے جو زبان سے تعلق رکھتی ہے، جس کے لئے زبان کو گویائی اور تکلم کی ضرورت ہے، لیکن اِس دُنیا میں ایک دوسری خاموش بلاغت اور گویائی بھی ہے، وہ گویائی، جس کے لئے کانوں کی ضرورت نہیں ہے کہ کان سُنیں، بلکہ اُس گویائی کو آنکھوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ آنکھیں اُس کا مطالعہ کریں۔

تہذیب کا مدفن

میں آپ کو یاد دِلاتا ہوں کہ حقیقتاً اٹھارہ مہینے گذرنے کے بعد جو آپ کی اِس تحریک کے بعد گذر چکے ہیں، جو تحریکِ خلافت اور آزادیِ ہند کی تحریک پر گذر چکے ہیں، اگر ایک ایسی مجلس میں جو میرے چاروں طرف فراہم ہے، اِس امر کی ضرورت ہے کہ اُس کے آگے ماتم اور فریاد کی جاوے۔ التجاؤں کا ہاتھ پھیلایا جاوے۔ تمام حقائق و معارف کا دفتر کھولا جائے، تو میرے عزیزو، خاص کر وہ جو آگرہ کے باشندے ہیں، بلکہ جو ہندوستان کی گذشتہ تاریخ کے مدفن کے باشندے ہیں، اگر اب بھی ان کو ضرورت ہے خطبوں کی، تقریروں کی، تو وہ اِن تقریروں کے لئے میری گویائی کا انتظار نہ کریں۔ آیئے ہم اور آپ چشمِ تصور سے کام لیں اور چند منٹوں کے لئے اُس جمنا کے کنارے پہنچیں، جس کو آج ہی میں نے علی گڈھ سے آتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے اُس جمنا میں اُتنا پانی بھی نہ پایا، جتنا خون اِن پانچ سالوں میں مسلمانوں کا ہو چکا ہے۔ اگر آپ میری ہمراہی کریں گے تو میں آپ کے لئے ایک بہترین آواز کی زبان کو، ایک بہترین دفترِ عبرت کو وہاں مہیا پاتا ہوں۔ وہاں زبان نہیں ہے، وہاں ایک مجسم فصاحت موجود ہے۔ وہاں ایک مجسم خطبہ موجود ہے۔ وہ جلیل عمارت موجود ہے۔ جو ہندوستان کی گذشتہ عظمت پر ماتم کر رہی ہے۔ وہاں شاہجہاں کا مدفن اور آرام گاہ موجود ہے۔ اِس ... پڑھ کر ... بھی کوئی زبان ہو سکتی ہے، جو تمہارے کانوں کو مخاطب کر سکتی ہے؟

میں نہیں سمجھتا کہ اِس آبادی میں اِس تہذیب کے مدفن میں اِس عالم کی قربان گاہ میں مَیں کون سی چیز پیش کروں؟ اِس زمین کے ایک ایک چپّے کی خاموشی میں آواز موجود ہے اِس کے ایک ایک ٹوٹے ہوئے کھنڈر میں، اُن ٹوٹی ہوئی اینٹوں میں جن کا غبار ہوا میں اُڑ رہا ہے نصیحت موجود ہے، اِس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اِس موقع پر میرا فرض ایک خطیب کا فرض نہیں ہے۔ ایک مؤرّخ کا فرض نہیں ہے البتہ میرا فرض ایک فریادی اور ماتمی کا فرض ہے۔ جو آپ کے آگے اِس لئے نہیں آیا ہے کہ آپ کو کچھ سُنائے۔ بلکہ ماتم کرے اور آپ سے اُمید کرے کہ اگر آپ کی زندگی کے چند لمحے آپ کے معاملاتِ دنیا سے علاحدہ ہیں، تو آپ بھی اُس کے ماتم میں شریک ہوں۔

ہندو مسلم اتحاد

ہندوستان کے لئے ہندوستان کی آزادی کے لئے صداقت و حق پرستی کے بہترین

> اکتوبر ۱۹۲۱ء میں پراونشیل آگرہ خلافت کانفرنس منعقد ہوئی، مولانا صدر تھے اور کانفرنس میں اُن کی تقریریں ایسی ہوئیں کہ سُننے والے آج تک یاد کرتے ہیں۔ افسوس مولانا کی تقریریں محفوظ نہ رہ سکیں سی۔ آئی۔ ڈی کی رپورٹیں بھی تلف ہو چکی ہوں گی۔ اور موجود بھی ہوں تو سود مند نہیں ہو سکتیں۔ مولانا اس روانی اور تیزی سے بولتے تھے کہ رپورٹر کا قلم ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن خوش قسمتی سے آگرہ کی تقریریں محفوظ رہ گئی ہیں۔ غلام حسین خاں کوئی رپورٹر تھے، انھیں نے قلم بند کی تھیں، اور مجھے بالکل یاد نہیں کہ میرے قبضے میں کیونکر آ گئیں۔ بہرحال یہاں نقل کرتا ہوں۔ افتتاحی تقریر ۲۵ اکتوبر کو ہوئی اور اختتامی تقریر ۲۶ اکتوبر کو۔ یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ اِن تقریروں کے علاوہ مولانا کی کوئی تقریر کہیں محفوظ نہ ملے گی۔ اِس لئے اِن تقریروں کو بیش بہا تحفہ سمجھنا چاہیئے۔ یہ تقریریں اتنی طویل مدت کے بعد آج بھی دلوں میں زندہ ...

اور اعلیٰ ترین فرائض ادا کرنے کے لئے ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا اتفاق اور اُن کی یک جہتی ضروری ہے۔ میرا مقصد نہ تھا کہ مستقل طور پر اِس مسئلے کے متعلق کچھ کہوں، کیونکہ الحمدللہ یہ مسئلہ، عمل تک پہنچ چکا ہے۔ اب اِس امر کی ضرورت نہیں ہے کہ اِس پر بحث کی جائے، لیکن چونکہ تحریکِ خلافت کی تیسری منزل کے ضمن میں یہ مسئلہ چھڑ گیا ہے، لہٰذا آپ اجازت دیں گے کہ میں کچھ اِس کے متعلق کہہ دوں۔

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا مسئلہ اگرچہ اپنے ایک سیاسی مسئلہ ہونے کے لحاظ سے ہندوستان کی نجات کے لئے ایک ضروری مسئلہ رہا ہے لیکن یہ مسئلہ آج تحریکِ خلافت کی بدولت ہی ہمارے سامنے نہیں آیا ہے۔ بلکہ ہندوستان میں ایسے لوگ موجود تھے کہ تحریکِ خلافت کی بنا پر نہیں بلکہ چونکہ انھوں نے اپنی ہدایت کے لئے، اپنی ہر فکر اور ہر کلمہ کے ... حرف ایک ہی راستہ ہدایت کا پکڑ لیا تھا اِس لئے اسلام کے اصولوں نے، اسلامی تعلیم نے اُن کو مجبور کیا تھا کہ اُس کا ہندوستان میں اعلان کریں۔

تحریکِ خلافت سے تقریباً دس سال پہلے مَیں نے اِس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو بحیثیت ہندوستانی ہونے کے نہیں۔ یہ بھی ایک حیثیت ہے مگر سب سے پہلی حیثیت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے اُن کا فرض ہے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں۔ میں اپنے سینے میں وہ دِل رکھتا ہوں جس کے لئے ہدایت کی کوئی شعاعیں نہیں ہو سکتیں جو فاطر السماوات نے نہ بھیجی ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے، جب تک وہ احکامِ اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کر لیں۔ یہ اعتقاد قرآن مجید کی نصِ قطعی پر مبنی تھا فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے جو ایک طرف ترکِ موالات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے، اور دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلے کو واضح کرتی ہے۔ ترکِ موالات کے ضمن میں قرآن مجید کے احکام کیا ہیں؟ موالات، ولا بمعنی سے ہے، ولایت کے معنے ہیں محبت اور اعانت اور نصرت تو ترکِ موالات یعنی مددگاری کے ہر طرح کے تعلقات کو منقطع کر لینا جب تک وہ جماعت اپنے ظلم سے باز نہ آئے

دو قسم کی قومیں

قرآن مجید نے دُنیا کی تمام غیر مسلم قوموں کی دو قسمیں قرار دی ہیں، یہ تقسیم سورۂ ممتحنہ میں موجود ہے، قرآن مجید نے بتایا ہے کہ دو قسم کی قومیں دُنیا میں ہو سکتی ہیں، ایک تو غیر مسلمان قومیں ہیں جو مسلمانوں پر حملہ نہیں کرتیں، مسلمانوں کی حکومت اور خلافت پر حملہ نہیں کرتیں۔ ایسی غیر مسلم قومیں جنھوں نے نہ تو حملہ کیا ہے اور نہ مسلمانوں کی آبادیوں اور بستیوں پر حملہ کرنا چاہتی ہیں، ایسی قوموں کے لئے قرآن ایک لمحہ کے لئے بھی مسلمانوں کو نہیں روکتا کہ اُن کے ساتھ مصالحت کریں، اور بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا سلوک کریں۔ لیکن جن غیر مسلمان قوموں کا یہ حال ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ قتال کریں، مسلمانوں کو اُن کی بستیوں سے نکالیں، تو اُن قوموں کی نسبت بلاشبہ قرآن مجید کی یہ تعلیم ہے۔ اور قرآن مجید کا یہ قانون، کامل انصاف اور عدالت پر مبنی ہے جس کو خود خدا کی فطرت نے قائم کیا ہے، اسی عالمگیر اور ہمہ گیر صداقت کی بنا پر قرآن مجید کا اعلان ہے، کہ ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ مسلمان کوئی ایسا تعلق نہ رکھیں، جو محبت، دوستی، صلح و وفاداری اور کسی طرح کی اعانت و نصرت کا ہو یہ حکم قطعی متعدد آیاتِ قرآنی میں موجود ہے۔ سورۂ ممتحنہ میں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اُس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات سے نہیں روکتا کہ جن نا مسلمانوں نے تم سے دین کی لڑائی نہیں لڑی ہے، نہ قتال کیا ہے، نہ مسلمانوں کو تمہاری آبادیوں سے نکالا ہے۔ اگر مسلمان ایسے نا مسلمانوں کے ساتھ اتحاد کریں اور ہر طرح کی بہتر سے بہتر سلوک جو وہ کر سکتے ہیں کریں ... قرآن تمہیں اِس سے نہیں روکتا، قرآن دُنیا میں دشمنی کا پیام نہیں لایا ہے، وہ تو محبت کا پیام لایا ہے اِس لئے محبت کے قائم ... ضروری ہے کہ ٹھیک اُسی قانون کے مطابق جس کی رُو سے ... مجھ کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کرتی ہے مستحق نہیں ہا ایسی غیر مسلمان قوموں کے ساتھ کوئی ... محبت، اعانت اور نصرت کا نہیں رہ سکتا۔ ابوالکلام کے دشمن ...
باقی صفحہ ۳۱ پر

مولانا آزاد کی شاعری

خود مولانا آزاد کے قلم سے

مولانا آزاد نے اپنی ابتدائی زندگی میں شاعری بھی کی ہے۔ اور کچھ رسائل میں اُن کا کلام چھپا بھی ہے۔ لیکن وہ کہیں محفوظ نہیں رہ سکا۔ پھر یہ کہ خود مولانا کو شاعری سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی اور اُن کی طبیعت نثر کی طرف مائل ہو گئی۔ اور وہ شاعر سے ادیب بن گئے لیکن وہ نثر میں بھی شاعری کرتے تھے۔ بہرحال اپنی شاعری کے متعلق مولانا نے خود ایک خط میں مولانا غلام رسول مہر کے نام جو تبصرہ کیا ہے وہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ ملاحظہ کیجئے مولانا لکھتے ہیں:—

کلکتہ۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۳۶ء عزیزی

خط پہنچا۔ میر تقی والی حکایت مندرجۂ "یادگار غالب" عام حالات میں تو ضرور مستبعد معلوم ہوتی ہے لیکن خاص خاص حالات میں چنداں مستبعد نہیں۔ غالب نے خود لکھا ہے کہ میری تیرہ برس کی عمر تھی۔ جب ملا عبدالصمد میرے مکان پر آکر مقیم ہوا۔ اور فارسی زبان کے اصول و قواعد میرے دماغ میں پیوست کر دیئے۔ عبدالصمد دو سال تک ٹھہرا تھا۔ اگر تیرہ برس کی عمر میں آیا ہو گا تو گویا زیادہ سے زیادہ پندرہ برس کی عمر تک استفادہ کا موقع ملا ہو گا۔ اگر غالب کی قدرتی استعداد و مناسبت کا یہ حال تھا کہ چودہ سال کی عمر میں فارسی زبان کے ان رموز و غوامض کا متحمل ہو سکتا تھا۔ جن سے سراج الدین علی خاں آرزو۔ شمس الدین فقیر اور ٹیک چند بہار جیسے دماغ سوختگان مدارس عمر بھر کے درس و تدریس کے بعد بھی آشنا نہ ہو سکے۔ تو یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا ہو۔ اور ندرت و غرابت کی وجہ سے اس بات کا چرچا لوگوں میں ہونے لگا ہو۔ حتیٰ کہ میر صاحب تک یہ تذکرہ کسی نے پہنچا دیا ہو؟

اس طرح کے تذکروں میں خود اپنا حال بیان کرنے لگنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن محض رفع غرابت کے لئے لکھتا ہوں۔ کہ خود میں نے اسی عمر میں شاعری شروع کر دی۔ تھی میری نثر نویسی کا آغاز بھی اسی عمر میں ہوا ہے۔ غالباً ۱۸۹۹ء کی بات ہے کہ بمبئی سے حکیم عبدالحمید فرخ نے جو "پنچ بہادر" نکالا کرتے تھے ایک گلدستہ "ارمغان فرخ" کے نام سے نکالا۔ اور کلکتہ میں بعض شعرا اس کی ماہوار طرحوں پر مشاعرہ کرنے لگے۔ ایک مرتبہ اس کی طرح تھی۔

پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

میں نے گیارہ شعر کی غزل لکھی تین شعر ان مزخرفات کے اب تک ذہن سے ضائع نہیں ہوئے ہیں

نشتر بہ دل ہے آہ کسی سخت جان کی
نکلی صدا تو فصد کھلے گی زبان کی

گنبد ہے گردباد تو ہے شامیانہ گرد
شرمندہ میری قبر نہیں سائبان کی

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

یہ اشعار اب کس قدر لغو معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اسوقت انہیں لغویات نے لوگوں کو متحیر کر دیا تھا۔ آج بھی چھتیس برس گذر چکے ہیں، اپنی وہ خوشی پوری طرح محسوس کر رہا ہوں، جو مجھے اُسوقت محسوس ہوئی تھی جب "ارمغان فرخ" میں یہ غزل چھپ کر آئی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار میں نے اپنا نام ایک رسالہ میں چھپا ہوا دیکھا تھا۔

اس زمانے میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے انھیں کسی طرح یقین نہ ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سُناتا ہوں میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ اِن سے مڈ بھیڑ ہو گئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے جس کی دوکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے ایک شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ میں بیمار ہوں وہ غزل کے لئے متقاضی ہے۔ چند شعر اسی وقت کہہ دو۔ میں سمجھ گیا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے زمین بتلائی "یاد نہ ہو۔ شاد نہ ہو"—— میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر کہہ دیئے۔ کہنے لگے اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیئے۔ میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔

وعدہ وصل بھی کچھ طرفہ تماشہ کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے—— "صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو۔ لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی"—— اسوقت سوچتا ہوں تو یہ معلوم ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔

پھر اسی زمانے میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی۔ "مخزن" نیا نیا نکلا تھا۔ اس میں چند تحریریں بھیجیں۔ لکھنؤ سے نوبت رائے نظر "خدنگ نظر" نکالا کرتے تھے اس میں اپنی غزلیں بھیجا کرتا تھا۔ انہیں آمادہ کیا کہ نثر کا ایک حصہ بھی شامل کر دیں اور اس کی ترتیب اپنے ذمے لی۔ اسی زمانہ میں مولوی احمد حسن مرحوم فتحپوری نے کلکتہ سے "احسن الاخبار" اور "تحفۂ احمدیہ" نکالا۔ اس میں بالالتزام مضامین نویسی ہونے لگی۔ پھر خیال ہوا کہ یہ کافی نہیں، ایک رسالہ خود نکالنا چاہیئے۔ چنانچہ "لسان الصدق" جاری کیا۔ یہ تمام معاملات ۱۹۰۳ء و ۱۹۰۴ء کے ہیں۔ اُس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

تعلیم سے میں پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا کہ فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا تاکہ جو کتابیں پڑھی جا چکی ہیں۔ وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ منجھ جائیں۔ اس لئے والد مرحوم نے چند طلبا کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کرا دیا تھا۔ اِن میں قندھار کے ایک خاں صاحب تھے، جن کی داڑھی میرے قد سے بھی زیادہ دراز تھی۔

اسی زمانے میں تقریر کی طرف طبیعت مائل ہوئی سب سے پہلی تقریر میں نے ۱۹۰۳ء میں کی۔ اُس وقت عمر پندرہ تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت الاسلام کے جلسہ میں شریک ہوا تھا اور تقریر کی تھی۔ اس وقت سولہ برس کی عمر تھی۔

بہرحال مقصود یہ ہے کہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں شعر کہنا کوئی بہت زیادہ غیر معمولی بات نہیں ہے اگر اس عمر میں میں تک بندی کرنے لگا تھا تو غالب جیسی شخصیت کے لئے جسے قدرت نے شاعری ہی کے لئے پیدا کیا تھا۔ یہ بات کیوں مستبعد تصور کی جائے۔

ابوالکلام

مرثیۂ آزاد

کیا حادثہ شدید پیش آیا ہے
جس نے اہل وطن کو تڑپایا ہے
ہے زلزلۂ عظیم آزاد کی موت
جس سے بھارت تمام تھرایا ہے

قطعہ تاریخ وفات

چوں رفت ز دہر آں یگانہ
مجموعۂ ادب، سیاست استاد
حیراں بودم بہ فکر تاریخ
ہاتف ز فلک ندا چنیں داد
گویا سرہائے یازدہ بار
لے وائے ابوالکلام آزاد

آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اتر آئے اور دلّی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ مگر اس سے دست بردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سوراج میں تاخیر ہوئی تو ہندوستان کا نقصان ہو گا۔ لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہو گا۔ مولانا آزاد

آزاد کی ایک غزل

مولانا اپنے اوائل شباب میں شعر و شاعری کی طرف بھی راغب رہے ہیں۔ یہ غزل ان کے اسی دور کی یادگار ہے۔ لہذا بطور تبرک کے پیش کی جا رہی ہے کوئی شبہ نہیں کہ مولانا اگر آگے بھی شعر گوئی کی طرف متوجہ رہتے تو بحیثیت شاعر کے بھی اپنے لئے ایک منفرد اور ممتاز مقام حاصل کر لیتے۔ ادارہ

کیوں اسیر گیسوئے خمدار قاتل ہو گیا
ہائے کیا بیٹھے بٹھائے تجھ کو اے دل ہو گیا

کوئی نالاں کوئی گریاں کوئی بسمل ہو گیا
اس کے اٹھتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہو گیا

انتظار اس گل کا اس درجہ کیا گلزار میں
نور آخر دیدۂ نرگس کا زائل ہو گیا

اس نے تلواریں لگائیں ایسے کچھ انداز سے
دل کا ہر ارماں فدائے دست قاتل ہو گیا

قیس مجنوں کا تصور بڑھ گیا جب نجد میں
ہر بگولا دشت کا لیلیٰ کا محمل ہو گیا

یہ بھی قیدی ہو گیا آخر کمند زلف کا
لے اسیروں میں ترے آزاد شامل ہو گیا

ہندستان کی زندگی میں اردو کی جو واقعی زندگی ہے وہ ملنی چاہیے

اردو کی جگہ وہی ہے جو دوسری زبانوں کی ہے بہت سے لوگ اب بھی رقیب کی حیثیت سے دیکھتے ہیں

ہندی کو جو جگہ ملنی تھی مل گئی ہے ہر ہندوستانی اسکے آگے سر جھکائے لیکن اس کے ساتھ اردو کو اسکی جو جگہ ہے وہ ملنی چاہیئے

ذیل میں ہم مولانا آزاد کی آخری عوامی تقریر درج کر رہے ہیں جو وفات سے ایک ہفتہ پہلے مولانا آزاد نے ... میں اسی جگہ کی تھی جہاں آج آن کا مزار ہے۔ اردو کا مسئلہ آج بھی اسی طرح ہے جیسے اس وقت تھا اور ہم مولانا کی یہ آخری تقریر آن کی وصیت اور خواہش کے طور پر درج کرکے ہندوستان کو آن کا فرض یاد دلا رہے ہیں (ادارہ)

جناب صدر و دوستو!

جہاں تک مجھے اندازہ ہوا ہے۔ آج آپ نے یہ مجلس اس لئے منعقد کی ہے کہ ہندوستان کی زندگی میں اردو کی جو واقعی جگہ ہے وہ ملنی چاہیئے یہ نہیں کہ کسی زبان کی جگہ خالی کی جائے اور وہ اسے دے دیا جائے۔

آپ اردو کے حامی ہیں۔ لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں ہیں جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت جی (پنڈت سندر لال) نے کہا یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ہندی کا مخالف ہو یہی صحیح اسپرٹ ہے۔ اور اسی سپرٹ سے مل کر راستہ صاف ہوتا ہے تیس یا چالیس سال پہلے زبان کے بارے میں یہ جھگڑا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو جو لوگ اردو کے حامی تھے وہ چاہتے تھے کہ اردو ملک کی زبان ہو اور جو ہندی کے حامی تھے ان کی خواہش تھی کہ ہندی ہو یہ معاملہ اس وقت گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔ کیونکہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی رقیب بن گئی تھیں اردو والے کہتے تھے کہ اگر ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کیا گیا تو اردو ختم ہو جائے گی۔ اور ہندی والے کہتے تھے کہ اگر اردو کو ملک کی زبان تسلیم کیا گیا تو ہندی ختم ہو جائے گی۔

ہم ہر وقت اس نگاہ سے اس سوال کو دیکھتے تھے اور اسی کے عادی ہوگئے تھے۔ چنانچہ جب یہ سوال سامنے آتا تو اسی ترازو میں تولا جاتا۔ اسی حالت میں ملک آزاد ہوا وقت آیا دستور بنا۔ اسمبلی میں کافی بحث ہوئی اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں اردو کی حیثیت میں ایک انقلاب ہو گیا۔ اور اردو کی حیثیت ایک رقیب سے کم ہو گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے فرض ہے کہ اسے مانے۔ وہ اس کے خلاف جا نہیں سکتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو کی کیا جگہ ہے اس کی وہی حیثیت ہے جو دوسری زبانوں کی ہے۔ بہت سے لوگ اب بھی اسے رقیب کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، حالانکہ اب یہ بات نہیں ہے۔ اب یہ سوال تو اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کون سی ہوگی۔ ہندی کو جو جگہ ملنی تھی، وہ اسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکالے لیکن اسی کے ساتھ اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیئے۔ اسے حکومت بھی تسلیم کرلے اور ہر ہندوستانی بھی مانے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو کثرت کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ نہ صرف شمال میں بلکہ جنوب میں بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد۔ تلنگانہ کے علاقہ میں اردو بولی جاتی ہے۔ میسور میں لاکھوں آدمی اردو بولتے ہیں۔ اسی طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یوپی۔ بہار۔ دلی اور پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کے لاکھوں اور ہزاروں آدمی اردو بولتے ہیں مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کے لئے بلائی گئی ہے اس میں اسے کامیابی ہوگی۔ اور جب کہ وزیر اعظم نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔

(ابوالکلام آزاد)

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ کوئی انسان یا انسانوں کی گڑھی ہوئی بیورو کریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے محکومی اور غلامی کے لئے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لئے جائیں لیکن وہ غلامی ہی ہے۔ اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ لیکن میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز گورنمنٹ تسلیم نہیں کرتا۔ اور اپنا ملکی مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔

دو بھائی

ضیاء الحسن علوی

مولانا آزاد کے سلسلے میں کئی نمبر شائع ہوئے مگر مولانا کے خاندان کا ان نمبروں میں واضح ذکر نہیں آیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا آزاد کے ایک بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ بھی تھے۔ یہ انہیں کا ذکر ہے جو ہم عبداللہ بٹ کی کتاب "ابوالکلام آزاد" سے پیش کر رہے ہیں ۔۔۔ اس سے دونوں بھائیوں کی ایک ایسی تصویر سامنے آجائے گی جو بہت کم لوگوں نے دیکھی ہوگی اور جسکی چند دھندلے عکس بھی اب شاید ہی ذہنوں میں محفوظ ہوں (ادارہ)

ایجوکیشنل کانفرنس کا روپ میلا ختم ہونے کو آیا شام کو حسام الملک نواب علی حسن خاں صاحب کی طرف سے قیصر باغ میں بارہ دری کے جنوبی لان پر پارٹی (بقول حیدرآبادیوں کے عصرانہ) تھی۔ لوگ رخصتی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر شمس العلماء نذیر احمد صاحب سے کھڑے ایک صاحبزادے گورے گورے سیاہ ترکش کوٹ اور ایرانی ٹوپی پہنے۔ چہرا بڑا سا مگر قد پر موزوں۔ بظاہر برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن تقطف الزہور ہاتھ میں لئے نہایت طراری سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ اپنے سن کی مناسبت کا دوسرا شخص پا کر رجحان طبعی ان سے ملنے کو ہوا۔ پاس، قاری میراں شاہ ندوہ والے کھڑے تھے۔ وہ بڑے جہانیاں جہاں گشت اور جہاندیدہ تھے۔ ان سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں۔ انھوں نے ان کی پوری تعریف بتادی۔ ان کے مضامین رسائل میں دیکھے تھے چند ہی منٹ میں وہ کھینچ کر میری جانب آنکلے۔ قاری صاحب نے تعارف کرایا۔

انھوں نے کہا کہ میں علامہ شبلی سے مل کر بمبئی سے آرہا ہوں لیجئے دو دل مل گئے۔ ان کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے جو ان سے کچھ بڑے معلوم ہوتے تھے تقطیع تو دونوں کی ملتی تھی مگر ان کا رنگ مدھم تھا دونوں کی ناکوں میں کشمیریت تھی یہ دونوں بھائی تھے ان کے مضامین بھی رسالوں میں دیکھے تھے مگر وہ خاموش اور متین زیادہ تھے کانفرنس کے خیال سے بمبئی سے چلے تھے راہ میں نہ جانے کہاں اٹک گئے سیلانی تو تھے ہی کانفرنس کی حالت نزع میں لکھنؤ پہنچے۔ خیر صورت دیکھ لی تھوڑی دیر تک ہم لوگ خیمہ میں بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں ہمارے ایک اور عزیز آگئے۔ غرض وہ اٹھ کر جناب مفتی احتشام علی صاحب قبلہ کی کوٹھی پر آگئے اب اطمینان سے ہم تینوں میں باتیں ہونے لگیں وہ مجھ پر اپنا علمی رعب جمانے لگے۔ بھلا میں کب مچھے پر ہاتھ رکھنے دینے والا تھا۔ اس میں تو وہ کچھ ٹھہرے نہیں لیکن ہاں فن تومیات اور عام معلومات اور سرسید اور ان کے حواریوں کے لٹریچر کے وہ حافظ ضرور تھے۔ مگر بلا کے ذہین تھے اشہب زبان اور اشہب قلم دونوں سرپٹ بھرتے تھے۔ بڑے بھائی کا نام ابوالنصر غلام یٰسین آہ تھا اور چھوٹے کا ابوالکلام محی الدین آزاد تھا۔ ہمارے دوست مولانا ابوالکلام تو اس وقت ہندوستان کے سرتاج ہیں۔ ان کی مزے مزے کی باتیں آگے چل کر سنئے گا۔ مگر ابوالنصر مرحوم کس کو یاد ہوں گے ان کو یاد رکھنے کو ان کا ایک قطعہ لکھتا ہوں وہ سن لیجئے اور ان کی روح پر فاتحہ پڑھئے وھوھذا ؎

عدو کے ساتھ وہ تصویر اپنی کھنچوائیں
نئے طریق سے اظہار رسم و راہ کریں
ہمارے پاس بھی بھیجیں اسے شرارت سے
کہ حال رشک سے رو رو کے ہم تباہ کریں
غضب ہے اس پہ زبانی پیام بھی آئے
ہمارے سر کی قسم ہے انہیں جو آہ کریں

ابوالنصر مرحوم سے چند روزہ وہ پہلی اور آخری ملاقات رہی اب انشاء اللہ آخرت میں پھر ہوگی مگر ان کا اثر دل پر ہے۔ اس زمانے میں ہمارے دوست ابوالکلام ایک روٹھنے والے معشوق کی طرح ایک رسالہ لسان الصدق بھی نکالتے تھے جس کو توام الضحیٰ کا مرض تھا۔

علامہ شبلی بمبئی سے واپس ہوئے تو الندوہ کے کام کے متعلق مشورت ہوئی کہ بغیر کسی مددگار کے یہ کام اب دشوار ہوگیا ہے علامہ کو پسند نہ تھا کہ ہم تعلیم کی راہ کو چھوڑیں اور ابھی سے زیادہ تصنیف و تالیف میں مصروف ہوں جو تجویزات علامہ نے فرمائی وہ میرے دل کی لگی تھی ہمارے دوست مولانا ابوالکلام آزاد کا تقرر اس جگہ پر ہوگیا۔ اس میرے یار کو روپیہ کی طلب اور طمع تو تھی نہیں گھر بیٹھتا تو کھانے کو بہت تھا اور باپ کی طرح خاندانی مسند ارشاد و تعلیم پر بیٹھ کر دست غیب سنبھالتا تو پیر مغاں تو بن ہی جاتا مگر اس کو مولانا کے پاس رہ کر انھوں نے ایک وظیفہ اپنی تعلیمی ترقی کے لئے سمجھا اور علمی عیاشی اور یار باشی میں وقت کٹنے لگا ؎

عہد پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں

مولانا تو اب سن سفید ہوگئے ہیں، مجھ میں ابھی خزاں کے کچھ پھول باقی ہیں، ملاقات عنقا، وہ آزاد ٹھہرے، میں قید۔ اگرچہ نینی کی قید سے وہ ابھی چھوٹے ہیں مگر میری ان کی ملاقات وہاں بھی حرام تھی۔ میں تو اب ان میں ہوں بقول اصغر ؎

پھولوں کا ڈھیر روز لگاتے ہیں گل فروش
رہتا ہے پھول والوں کا میلا قفس کے گرد

آزاد لکھنؤ کیا آئے میں نے آزادی اختیار کرلی۔ مزے میں وقت کٹتا کبھی علامہ کی کی صحبت اور کبھی شرر صاحب کی اور کبھی خود ہماری اول الذکر دو صحبتیں علمی ہوتیں۔ مگر اس نج کی صحبت میں دنیا و مافیہا کی باتوں پر خیال آرائیاں۔ خوش گپی اور چائے کا دور رہتا۔ آزاد وہ کون مگر عنفوان شباب کے آزاد کا مزاحیہ پہلو اب تک دل میں گدگدی پیدا کرتا رہا۔ ذہن کیا تھا ایک ہمہ گیر ریسیور۔ زبان کیا تھی دنیا بھر کا ریڈیو۔ قلم ایک ہوا باز بدامت، کتاب پر نظر ایک مرتبہ ڈالی اور وہ اپنی ہوگئی جس طرح چاہا جس مضمون کو ادا کر دیا۔ استعارے تشبیہیں اور اس کے ساتھ جدت طرازی کے پھول برساتا تھا کسی نے کہا ہے کہ کشمیر کے پھولوں کو روندتے ہوئے جی ملتا ہے۔ مگر کس کا جی جس کو کبھی کبھی یہ منظر نصیب ہو نہ کہ اہل کشمیر کا۔ یہ چیزیں آزاد کی تحریر و تقریر میں خود اس کے کشمیری پھول تھے۔ آپ کہیں گے کہ تم آزاد کی تعریف کرنے میں مبالغہ میں پڑ گئے میری معذرت قبول ہو۔ جوانی دیوانی کی یاد بڑھاپے میں رعنائی خیال کا سرچشمہ ہے میں اپنے لطف کی یاد میں مست ہوگیا آپ اس کو مبالغہ سمجھیں تو یہ آپ کی قدردانی ہے، اگر باور نہ ہو تو المراۃ المسلمہ کا اقتباس پرانے الندوہ کے صفحات میں پڑھ لیجئے آزاد نے اصل مضمون کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ میں نے کھل کر ایک مرتبہ ان کی تعریف کر دی اس کو ان کا ہیچ نہ سمجھئے اب بھی نہ کہوں گا ان کے قدردانوں کو کیا کمی ان کے مداحوں کی بہتات ہی مگر مجنوں نہ شاہد شد ہی ہیچ مانند لیجئے۔

مولانا آزاد کی خطابت

بقیہ صفحہ ۲۹ سے آگے

اس تقسیم کی رو سے آپ کے سامنے وکیبدا کا مسئلہ واضح طور پر آگیا۔

"اُمّۃً واحِدہ"

پہلے میں ایک لفظ کہوں گا اپنا، اور اس کے بعد آپ کو ایک لفظ سنا دوں گا۔

ایک دوسری زبان کا میں نے الفاظ یہ کہے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان ہندوستان کے بائیس کروڑ بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن ہو جائیں اب میں مسلمان بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب سے بڑی آواز جو ہو سکتی ہے وہ محمد کی آواز تھی۔ اس وجود مقدس نے عہد نامہ لکھا، بجنسہٖ اس کے الفاظ ہیں۔ ہم ان قبیلوں سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر ایک اُمّۃ واحدہ" بننا چاہتے ہیں"۔ اُمّۃ کے معنے ہیں قوم اور نیشن، اور واحدہ کے معنی ہیں ایک۔

اگر میں نے اپنی اپیل میں کہہ دیا کہ ہندوستان کے مسلمان اپنا بہترین فرض اسی وقت انجام دیں گے۔ جب وہ ہندوؤں کے ساتھ ایک ہو جائیں گے تو یہی وہ لفظ ہے جو اللہ کے رسول نے بھی اس وقت لکھایا تھا کہ ہم سب مل کر قریش کے مقابلے میں ایک نیشن ہو جائیں گے۔ جن مقاصد کی بنا پر جناب سرور کائنات نے یہ عہد کیا تھا، اس سے زیادہ وجوہ آج آپ کے لئے موجود ہیں۔ اگر اس وقت صرف قریش مکہ کی ایک جماعت تھی، جو اسلام کو غربت میں دھمکی دے رہی تھی۔ تو آج اس غربت ثانیہ میں صرف مٹھی بھر قریش نہیں بلکہ کرۂ ارضی کی دو تہائی بسنے والی قومیں، اسلام کو مٹانا چاہتی ہیں، اگر رسول خدا مٹھی بھر قریش مکہ کے مقابلے میں ابو سفیان کے مقابلے میں، اطراف مدینہ کے تمام قبائل سے اتفاق کر سکتے تھے۔ تو آج اس عظیم الشان قوت کے غرور، گھمنڈ خونخواری کے مقابلے میں جو تمام مشرق کی آزادی کو پامال کرنا چاہتی ہے، کیا ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض نہیں ہے کہ اپنے ہم وطن بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک ہو جائیں؟......

لیکن فاتح ایک دوسری حیثیت سے مفتوح قوم کے اخلاق و عادات پر بھی اثر ڈالتا ہے بالشان فطرتاً قوت ہی کے آگے سر جھکاتا ہے۔ اس لئے جب کوئی قوم اس پر غالب آجاتی ہے تو اس کو فطرتاً اُس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے

مولانا آزاد کا ایک خط جواہرلال کے نام

[یہ خط جہاں مولانا کی انگریزی علمیت کا پتہ دیتا ہے وہاں یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ جواہرلال کو اتنا ہی اردو پر عبور حاصل ہے جتنا انگریزی پر۔ یہ خط انگریزی سے ترجمہ ہے۔ اردو مولانا کی نہیں۔]

کلکتہ۔ ۲۷ر مارچ ۱۹۴۵ء

میرے پیارے جواہرلال!

کل پندرہ تاریخ کی صبح کو جب آپ نے میرے خطبہ کا انگریزی ترجمہ مجھے دیا میں نے اس پر ایک نظر ڈالی تھی اب میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ آپ نے میرے خطبہ کی روح انگریزی میں بعینہٖ ادا کر دی ہے واقعی آپ کی قابلیت اور اہلیت کی داد دیتا ہوں انگریزی زبان پر آپ کو اتنا عبور حاصل ہے یہ میں نہیں سمجھتا تھا میں کہہ سکتا ہوں کہ اس زمانے کے بہت قابل آدمی زیادہ وقت دے کر بھی یہ کام مشکل سے کر سکتے ہیں جب کہ آپ نے چند گھنٹوں میں بغیر تردد کے یہ کام کر دیا۔

ترجمہ کرنا زیادہ مشکل کام ہے یہ آسان کام نہیں کہ ایک زبان کی ادبی کیفیت کو قائم رکھ کر ترجمہ کیا جائے اور مصنف کے ادبی رجحان کو ترجمہ ظاہر کرے۔ صرف وہ شخص ہی ایسا ترجمہ کر سکتا ہے جس کو دونوں زبانوں پر عبور ہو۔ اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ آپ نے میرے اردو کے خطبہ کی ادائیگی کو انگریزی ترجمہ میں اس طرح برقرار رکھا ہے کہ پڑھنے والے کو یہ شبہ ہو کہ اصل انگریزی ہے اور ترجمہ اردو میں کیا گیا ہے اس ترجمہ کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ مصنف کے خیال کے رابطے کو قائم رکھا گیا ہے۔

بعض مقامات پر جہاں اردو متن کو تبدیل کر کے بڑھایا یا گھٹایا گیا ہے میرے مقصد اور مدعا کو بعینہٖ ادا کر دیا ہے مثال کے طور پر دو اسرائے کے اعلان پر میں نے اپنا تاثر یوں ادا کیا۔

"صفحوں پر صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی مشکل اس قدر بتلانے پر مستعد ہوتا ہے کہ" مشکل میری ادائیگی کی صنعت ہے میری ادائیگی کی صنعت کو برقرار رکھتے ہوئے آپ نے انگریزی میں یوں لکھا ہے ـــــ

AFTER READING PAGE AFTER PAGE THE CURTAIN IS AT LAST LIFTED WITH HESITATION. WE HAVE A GLIMPS

جو کچھ میں لفظ مشکل سے ادا کرنا چاہتا تھا۔ وہ آپ نے زیادہ زور کے ساتھ اس فقرے میں ادا کر دیا۔ اسی طرح اور بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے لیکن یہ ایک مثال کے طور پر بیان کیا ہے۔

میں الہ آباد ۳ تاریخ کو پہنچوں گا مجھے امید ہے کہ آپ اس وقت تک وہاں قیام کریں گے۔

دستخط

مخلص:۔ اے۔ کے۔ آزاد

وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے

بقیہ صفحہ (۸)

پہلے سے کہیں زیادہ نمایاں ہوتی جا رہی ہے۔ اجمل صاحب فرماتے ہیں :۔

"حضرت مولانا کی زندگی مختلف اور متضاد حصوں میں بٹی ہوئی ہے وہ ایک ہی زندگی اور ایک ہی وقت میں مصنف بھی ہیں۔ مفسر بھی ہیں مفکر بھی ہیں۔ فلسفی بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، شاعر بھی ہیں۔ اور ساتھ ہی سیاسی جد و جہد کے میدان میں سپہ سالار بھی ہیں۔ دینی علوم کے تبحر کے ساتھ معقلیات اور فلسفے کا ذوق بہت کم جمع ہوتا ہے۔ اور علم و ادب کے ذوق نے ایک ہی دماغ میں بہت کم آشیانہ بنایا ہے پھر علمی اور فکری زندگی کا میدان عملی سیاسیات کی جد و جہد سے اتنا دور واقع ہوا ہے کہ ایک ہی قدم دونوں میدانوں میں بہت کم اٹھ سکے ہیں۔ مگر مولانا آزاد کی زندگی ان تمام مختلف اور متضاد حیثیتوں کی جامع ہے۔ گویا ان کی ایک زندگی بہت سی زندگیوں سے مجموعہ بن گئی ہیں۔"

وہ ایک زندگی ختم ہوئی۔ گویا بہت سی زندگیوں کا مجموعہ ختم ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسی زندگی کا فسانہ۔ یا ایسی زندگیوں کا مجموعہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ جیسے اہل النظر بتا کر کہتے ہیں۔ وہ بہت سے روشن ابواب کا آغاز ہوتا ہے۔ کیونکہ بعد مرگ ایسے شاہیر کے نام اور کارنامے نمایاں آسمان کے تاروں کی طرح جگمگاتے ہیں۔ اور اس دنیا کے اندھیروں میں اجالا بھرتے ہیں۔

اجمل صاحب نے مولانا صاحب کی حیات میں ان کے متعلق بجا طور پر فرمایا تھا۔

"وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں"

میں محض تبدیل کرتے ہوئے اس مصرع پر چند تضمین کرنے کی جرات کرتا ہوں۔

مجسم عقل و دانش روحِ فن تھے
جہانِ علم پر وہ ضو فگن تھے
وقارِ قوم تھے شانِ وطن تھے
خزاں میں برگ تھے گل تھے چمن تھے
وہ اپنی ذات سے اک انجمن تھے

عشق میں رومی فکر میں رازی عزم کا منبع جہد کا حاصل
حسنِ عمل کا گوہرِ یکتا، علم و ہنر کا جلوۂ کامل!

اُس کی روش سے گردشِ دوراں اپنے کیے پر آ کے پشیماں
اس کی صدا سے سر بگریباں، شورشِ گیتی لشکرِ باطل

اس کی قلم کی جنبشِ ادنیٰ لولوئے لالہ ڈھال چکی ہے
اس کی ہنر تجدید کی خوگر اُس کا چلن تقلید کے قابل

اُس کی فصاحت تمدنِ شعری اس کی بلاغت مصدرِ معنی
اُس کی نفاست گلشن گلشن اس کی لطافت محفل محفل

اس کی روائی گنگ و جمن میں اس کی کہانی دار و رسن میں
اُس کی سیادت جادہ جادہ اُس کی قیادت منزل منزل!

اُس کے ادب میں بانگِ جرس ہے بانگِ جرس میں جوشِ جنوں ہے
جوشِ جنوں میں سوز دروں ہے سوز دروں میں جذبے شامل

اس کی جبیں پر شکنیں ہی شکنیں لب بستہ غنچوں کی صورت
اہلِ چمن سے پوچھ رہی ہیں آخر ان خدمات کا حاصل

بت خانہ کے طاق میں شورشِ شمعِ حرم کو دیکھ رہا ہوں
صحنِ چمن میں شام کو جیسے دورِ خزاں میں شورِ عنادل

سوانح آزاد (بقیہ ۲۴ سے آگے)

کہنا چاہیئے۔ کہتے ہیں۔

- طبیعت کا شوق اس قدر بڑھا کہ ایک گلدستہ نکالنے کا خبط ہوا..... گلدستہ بلا روپیہ کے نکل نہیں سکتا تھا۔ مگر اس وقت کے حالات بھی عجیب تھے۔ ہمارا حساب یہ تھا۔ کہ جس قدر رقم بھی روپیہ کی ہو سکتا ہے۔ صرف پہلے نمبر کے لئے ہے اور جہاں ایک نمبر نکل گیا۔ لوگ تمام دنیا اس طرح اس کے انتظار میں ہے کہ فوراً ہزاروں آدمی اس کے خریدار ہو جائیں گے۔ پھر روپے کی کیا کمی رہے گی ـــــ چنانچہ ہم نے اس وقت کے بچپنے اور طالب علمی کے بے سر و سامانی میں پچاس روپیہ کا انتظام کیا۔ لکتبہ کا ایک پریس ہادی پریس کے نام سے ہیرسن روڈ کلکتہ میں تھا والد مرحوم کی بعض چیزیں وہاں چھپا کرتی تھیں۔ ہم نے وہیں طباعت کا انتظام کیا۔ اور فوراً اعلان چھاپ کر تیار کر دیا۔ اعلان کا مضمون عبدالواحد نے لکھا تھا۔ اس کا نام "نیرنگ عالم" تجویز کیا گیا۔ اس تصور سے طبیعت کو کس قدر مسرت حاصل ہوئی تھی کہ عنقریب ایک ایسی چیز نکلے گی۔ جس کی لوح پر میرا نام بحیثیت مہتمم و ایڈیٹر کے درج ہوگا "

نیرنگ عالم کے تین چار شمارے بمشکل تمام مولانا نکال پائے تھے۔ اور پھر یہ گلدستہ بند ہو گیا۔ رفتہ رفتہ مولانا کی طبیعت مضمون نگاری کی طرف رجوع کرتی گئی۔ اور انہوں نے اس راہ میں پوری سرعت اور توجہ کے ساتھ قدم بڑھانا شروع کر دیئے۔ مضمون نگاری کے ابتدائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے بیان کیا ہے:-

"اس زمانہ میں اردو زبان بھی میری منجھی نہ تھی۔ اور ملک کا اثر غالب تھا۔ کلکتہ میں بجز والد کے اور کسی اہل زبان کی صحبت میسر نہ تھی تاہم شاعری کے ذوق نے بہت جلد اس کمی کو پورا کر دیا۔ مگر کتابت و انشاء کے لئے بجز مطالعہ کے اور کوئی دوسری راہ نہ تھی۔ بہر حال اپنے طور پر مضامین لکھنے لگا۔ اور آہستہ آہستہ مطالعے سے موضوع اور مطالب کے جمع اقتباس کی بھی راہیں نکلنے لگیں"۔

اسی کے ساتھ ساتھ مولانا کو خطابت اور تقریر کا شوق بھی پیدا ہوا لکھتے ہیں:-

- تعلیم سے ابھی پندرہ برس کی عمر میں فارغ ہو گیا تھا۔ اور چونکہ قدیم طریقہ یہ تھا۔ کہ فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک درس دینا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا۔ تاکہ جو کتابیں پڑھی جا چکی ہیں۔ وہ پڑھانے کے بعد اور زیادہ پختہ ہو جائیں اس لئے والد مرحوم نے چند طلبا کی کفالت کر کے تدریس کا سلسلہ بھی شروع کرا دیا۔ ان میں قندھار کے ایک خان صاحب تھے جن کی داڑھی میرے قد سے بھی دراز تھی۔ اسی زمانہ میں تقریر کی طرف طبیعت راغب ہوئی۔ سب سے پہلی تقریر میں نے ۱۹۰۳ء میں کی۔ اس وقت عمر پندرہ سال تک پہنچی تھی۔ غالباً دوسرے سال انجمن حمایت الاسلام کے جلسہ میں شریک ہوا تھا۔ اور تقریر بھی کی تھی۔ اس وقت سولہ برس کی عمر تھی "

تحریر و تقریر کے شوق کے ساتھ ساتھ صحافت کی لگن بھی بتدریج مولانا کے دل میں پروان چڑھ رہی تھی۔ اور عملی شکل میں نمودار ہونے کے لئے بے چین تھی۔ چنانچہ مولانا کی صحافتی زندگی کی عملی شکل سب سے پہلے "المصباح" میں ظاہر ہوئی۔ اس اخبار کے متعلق مولانا نے خود بیان کیا ہے:-

- محمد مہدی نامی ایک شخص نے نیا نیا اخبار جاری کیا تھا۔ اس نے خیال کیا کہ تجارتی اغراض سے کوئی اخبار نکالے۔ یہ میرے خاص ذوق کی بات تھی۔ جب میں نے اسے زیادہ ترغیب دی اور بلاآخر وہ آمادہ ہو گیا۔ "مصباح الشرق" مصر سے نکلتا تھا۔ میں نے اس کا نام "المصباح" تجویز کیا اور حقیقت وار اخبار کی شکل میں جاری ہوا۔ یہ دراصل پہلا اخبار ہے جو میں نے ایڈیٹ کیا۔ یہ ٹھیک ۱۹۰۰ء کے اواخر کی بات ہے "

مولانا کی مضمون نویسی اور صحافتی زندگی کی پر زور ابتدا دراصل "احسن الاخبار" سے ہوتی ہے مولوی احمد حسین مرحوم فتح پوری نے کلکتہ کے ایک تاجر کتب اور مالک مصطفائی پریس کو اس بات پر تیار کیا۔ کہ ان کی شرکت میں اخبار جاری کریں چنانچہ "احسن الاخبار" کے نام سے ایک ہفت روزہ جاری کیا گیا۔ مولانا لکھتے ہیں:-

"اس اخبار کی اشاعت سے اس وقت مجھے فائدہ ہوا۔ ایک تو مصری معروف طبع آزمائی پیدا ہونے کی وجہ سے ہر طرح کی مضامین نویسی کے لئے قوی تحریک و تشویق ہوئی۔ دوسرے اخبار کا ایک دفتر قائم ہو جانے کی وجہ سے تبادلے کے اخبارات و رسائل دیکھنے کا بہت اچھا موقع ملا "

جب "احسن الاخبار" بند ہوا تو تبادلے میں آنے والے اخبارات و رسائل بھی بند ہو گئے تشنگی ذوق کو سیراب کرنے کے لئے مولانا نے "لسان الصدق" جاری کیا۔ قوم کی ترقی اور اصلاح اس اخبار کا واحد مقصد تھا۔ معاصر

اخبارات نے اس پر عجیب طرح تبصرے کئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مولانا کو ایک پختہ کار کہنہ مشق اور تجربہ کار صحافی خیال کرتے تھے۔ اس وقت مولانا کی عمر ستر ہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ یہ اخبار سن ۱۹۰۳ء تک مولانا کی ادارت میں انجمن ترقی اردو کے آرگن ہونے کی حیثیت سے بھی نکلتا رہا۔ اور جب مولانا کو عراق کا سفر پیش آیا۔ تو اخبار بند ہو گیا۔

عراق سے واپسی کے بعد مولانا آزاد نے شبلی مرحوم کے پیہم اصرار کے بعد "الندوہ" جیسے علمی اور ادبی جریدے کی ادارت کے فرائض سنبھالے مولانا شبلی کہا کرتے تھے۔ کہ تمہارا ذہن اور دماغ عجائب روزگار میں سے ہے اور تمہیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور عجوبہ پیش کرنا چاہیئے۔ ساڑھے آٹھ مہینے "الندوہ" کی ادارت کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد چونکہ مولانا کو بعض اہم واقعات کی بنا پر لکھنؤ سے بمبئی آ جانا پڑا۔ تو یہیں شیخ غلام محمد مالک اخبار "وکیل" سے ملاقات ہوئی۔ اور انہوں نے بے حد اصرار و اشتیاق کے بعد مولانا کو "وکیل" کی ادارت کے فرائض سونپ دیئے۔

ایک سال تک مولانا وکیل کی ادارت کا کام انجام دیتے رہے۔ اسی اثنا میں مولانا کے بڑے بھائی مولانا ابو النصر آہ کا انتقال ہوا۔ اور ان کے والد نے امرت سر سے ان کی واپسی پر اصرار کیا۔ چنانچہ مولانا کلکتہ واپس آ گئے کچھ دن دارالسلطنت سے وابستہ رہے۔ پھر چند اختلافات کی بنا پر دارالسلطنت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ہندوستان کی سیاست ایک نئی کروٹ لے رہی تھی۔ تقسیم بنگال کی سازش نے حالات میں زیادہ تندی اور سختی پیدا کر دی تھی۔ برطانوی اقتدار اور غلامی کے خلاف جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا۔ اور قوم اپنے دشمن کے خلاف صف آرا ہوتے لگی تھی۔ ادھر سر سید خان مرحوم کی تحریک کے ساتھ انگریز پرستی اور وفاداری کی افیون کے نشہ میں اونگھ رہے تھے۔ مولانا آزاد کی آنکھیں یہ سب تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے وقت کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھیں۔ اور حالات کے تقاضوں کو محسوس کر کے ۱۹۱۲ء میں جنگ آزادی کا سب سے بڑا نقیب۔ نڈر بیباک اور بے مثال اخبار "الہلال" جاری کیا "الہلال" کی تاریخ جنگ آزادی کی ایک ناقابل فراموش تاریخ ہے۔ اور اردو صحافت کی ایک انمٹ مضبوط اور طاقتور بنیادوں کی امین۔ اس اخبار نے ملک کے کونے کونے میں اور خاص طور پر مسلمان حلقے میں ایک ہلچل اور زلزلہ پیدا کر دیا۔ اس کے بعد ۱۹۱۳ء میں مولانا نے "البلاغ" جاری کیا۔ اس وقت تک مولانا کی سیاسی اور صحافتی زندگی اچھی طرح چمک چکی تھی۔ اور وہ مجاہد آزادی کی حیثیت سے انگریز گورنمنٹ کی نظر میں کھٹکنے لگے تھے۔ آخر حکومت نے طرح طرح

کی رکاوٹیں ڈالیں اور ظلم و استبداد کے طرح طرح مولانا کی اس آواز کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ سن ۱۹۱۶ء میں انہیں رانچی میں نظر بند کر دیا گیا۔ سن ۱۹۲۰ء تک مولانا آزاد رانچی میں نظر بند رہے اور جب رہا ہو کر واپس آئے۔ تو ملک میں رولٹ ایکٹ کے خلاف زبردست تحریک چلائی جا رہی تھی علاوہ سر زمین ہند آتش فشاں کی طرح کھول رہی تھی۔ مولانا آزاد جن کے دل میں آزادی کا سچا جذبہ اور مادر وطن کی محبت کا طوفان ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ یہ دیکھ کر خاموش نہ رہ سکے۔ اور آنکھیں بند کر کے سیاست کے عملی میدان میں ایک بہادر سپاہی کی طرح شمشیر بکف آ گئے۔ جنوری سن ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کی ملاقات مہاتما گاندھی سے ہوئی۔ یہ مولانا کی مہاتما گاندھی کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ اور اس سلسلہ میں تھی۔ کہ ہندو اور مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن ترکی کے معاملہ میں وائسرائے ہند سے ملنے جا رہا تھا۔ اور مولانا آزاد کا نام بھی اس وفد کے ارکان میں شامل تھا۔ مولانا نے اس وفد کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اور کہا۔ کہ بھیک مانگنے اور گداگری کرنے سے آزادی اور مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ اس پر امن اس وقت کے بڑے بڑے لیڈروں۔ مولانا شوکت علی۔ محمد علی۔ عبدالباری مرحوم سب نے پر زور مخالفت کی۔ اور اس کے بعد انگریزوں کے خلاف ایک طاقتور تحریک کا ساتھ دو جو جنگ آزادی کی تحریک میں "ترک موالات" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بعد پرنس آف ویلز کی آمد پر دوسرے رہنماؤں کے ساتھ مولانا آزاد کو بھی کلکتہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ اور ایک سال کے لئے قید میں ڈال دیا گیا۔ رہائی کے بعد جب پھر عملی میدان میں آئے۔ تو رنگ ہی دوسرا پیدا ہو گیا۔ انگریز کی سیاست ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت اور طبقہ وارانہ نزاع پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اور دو قومی نظریے کا بھوت سامنے آ چکا تھا۔ ادھر خود کانگریس میں زبردست اختلافات پیدا ہو رہے تھے۔ ایسے میں مولانا کو کانگریس کی صدارت دی گئی۔ انہوں نے کانگریس کے دونوں گروپوں میں آشتی کرایا۔ اور حصول آزادی کی عام تحریک کے ساتھ پارلیمنٹری تحریک کا آغاز کیا۔ سن ۱۹۳۰ء سائمن کمیشن کے خلاف چلنے والی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سن ۱۹۴۰ء میں مولانا کانگریس کی صدارت کے لئے دوبارہ منتخب کئے گئے۔ اور تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ سن ۱۹۴۷ء کے بعد جب عبوری گورنمنٹ کا قیام عمل میں آیا تو مولانا کو وزارت تعلیم کا منصب تفویض کیا گیا۔ اور آخر تک وہ اسی پر رہے۔ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو ایک عظیم الشان تاریخ کا آخری باب پورا ہو گیا اور مولانا کا پیام رحمت ہو گئے۔

ایسی چنگاری بھی یا رب اپنے خاکستر میں تھی

سوانح آزاد کی تحریروں میں (بقیہ صفحہ ۳)

سے دیکھئے تو درخت ہی درخت ہیں منظر جاتے تھا بھی خاصی جگہ ہے اور ایک دو پنج بھی بچھی ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اب بھی یہ جگہ ہے یا نہیں؟ میں صبح سیر کے لئے نکلتا تو کتاب ساتھ لے جاتا۔ اور اس جھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا ——— والد مرحوم کے خادم حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجلا جھنجلا کر کہتے۔ "اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی۔ تو گھر سے نکلا کیوں تھا؟" یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اسی طرح کے کئی جھنڈ تھے۔ ایک جھنڈ جو برما پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا۔ اور شاید اب بھی ہو۔ میں نے چن لیا تھا کیونکہ اس طرف لوگوں کا گزر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا۔ اور شام تک اس کے اندر گھسا رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ تو دل کا عجب حال ہوتا ہے ؎

عالم بے خبری طرفہ تماشہ بود ست
حیف صد حیف کہ از دور خبر وا شدیم

اگرچہ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف اس کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں۔ اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کن شہر تھا۔ لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا۔ کہ کھیل کود کی طرف رخ ہی نہیں کرتی تھی۔

ہم شہر پُر ز خوباں منم و خیال ما ہے
چہ کنم کہ نفس بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

والد مرحوم میرے اس شوق علم سے خوش ہوتے مگر فرماتے یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ لے گا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری۔ مگر دل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی نہ پنپ سکا۔"

تحصیل علم اور شوق کا عالم یہ تھا کہ بچپن میں جو پیسے تماشہ کے لئے ان کو ملتے تھے۔ وہ انہیں کسی دوسری طرح سے ضائع نہ کرتے۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کرتے رہتے۔ اور پھر ان سے اپنے شوق و دلچسپی کی کتابیں خرید لیتے۔

فرماتے ہیں:۔

"دس سال کی عمر میں مجھے کتابوں کا اتنا شوق ہو گیا تھا۔ کہ جو پیسے ملتے تھے۔ ان کو جمع کرتا تھا اور ان سے کتابیں خریدتا تھا۔"

مطالعہ کے اشتیاق اور مطالعہ کی طلب نے انہیں کائنات، علم و مذہب کی ایک ایک راہ اور وادی کی طرف کھینچا۔ اور ان کی فطرت اس بات پر قانع نہ رہی کہ صرف مذہبی اور درسی کتابوں پر اکتفا کرتے۔ انہوں نے اس سے آگے قدم بڑھائے۔ اور وہ ان گنت موضوعات جو ان کے چاروں طرف بکھرے پڑے تھے ان سب نے ان کے دل کو اپنی طرف کھینچا۔ اگرچہ گھر کا ماحول اور والد کی سخت نگرانی اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی۔ کہ درسی نصاب کے علاوہ کوئی دوسری چیز بھی نظر سے گزرے۔ تاہم وہ ان بندشوں میں زیادہ عرصہ تک مقید نہ رہ سکے اور تنکوں کی بارھ کو توڑ کر طوفان نے اپنا راستہ نکال لیا۔ عمر کے اس حصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا نے اپنے شوق علم کی داستان اس طرح بیان کی ہے:۔

"اس اثنا میں۔ مجھے اردو کتابوں کے مطالعہ کا شوق ہوا۔ یہ بھی گویا ایک تعلیمی بدچلنی تھی۔ جس کو ہم صرف ایک جرم کی طرح مخفی طور پر ہی کر سکتے تھے لیکن ظاہر تھا کہ یہ شوق بھی تکمیل کرد کا شوق نہ تھا"

مولانا آزاد کے والد اپنے اوقات اور معمولات زندگی کے اس قدر پابند تھے کہ سخت حالات میں بھی ان میں ذرہ برابر فرق کا پیدا ہونا انہیں کسی صورت گوارا نہ ہوتا تھا۔ معمولات کی رو سے مولانا کو صبح کی وقت نماز سے فارغ ہو کر والد سے سبق لینا پڑتا تھا۔ اس کے بعد باہر جو استاد پڑھانے تھے۔ ان کے سبق کا وقت آ جاتا۔ دوپہر کو صبح کا آموختہ یاد کرنے اور آگے کی تیاری کرنے میں گزر جاتا۔ سہ پہر کو پھر والد صاحب کی خدمت میں حاضری ضروری ہوتی۔ اور پڑھے ہوئے سبق کو دہرانا ہوتا۔ مغرب کے بعد پھر ایک سبق والد سے لیتے۔ اس طرح وقت کا سارا حصہ درسی کتابوں کی نذر ہو جاتا۔ اور مولانا کی بے چین طبیعت جو اس سے آگے بڑھنے اور طرح طرح کی راہوں پر چلنے کے لئے بے چین تھی۔ کسی طرح سکون نہ پاتی۔ چنانچہ انہوں نے اس کا ایک دوسرا راستہ نکالا۔ کہتے ہیں:۔

"اب جو وقت رہ گیا۔ وہ صرف سونے ہی کا ہے اپنے شوق کے مطالعہ کے لئے صرف اسی میں بچت نکل سکتی تھی۔ چنانچہ میں اپنے بستر کے نیچے کتابیں رکھتا۔ اور موم بتی جلا کے مطالعہ کرنے لگ جاتا۔ اگر دن کو درسی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ تو درسی کتابوں کو لپیٹ کر مطالعہ کرتا۔ اکثر ایک ایک دو دو بجے شب تک مشغولیت رہتی۔ اسی وجہ سے اس وقت میری صحت میں فرق آنے لگا۔ یہ ٹھیک دس سے بارہ برس کی عمر کا واقعہ ہے والد اس کے نہایت مخالف تھے۔ تاہم درسی کتابوں کی تحصیل کی بھی حتمی مقدار تھی۔ اس میں حفظ صحت اور تفریح کا کہاں وقت نکل سکتا تھا اصل یہ ہے کہ طبیعت کو ابتدا ہی میں جب اس طریق پر ابھرنے کا موقعہ نہ ملا۔ تو اس کے تمام جذبات مرجھا گئے۔ اور پھر اس طرف ایسے لگے۔ کہ تمام جذبات کا مصرف مطالعہ و درس ہی ہو گیا"

بارہ تیرہ برس کی عمر تھی کہ انہوں نے عربی و فارسی کی درسی کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری غیر درسی اور اردو کی کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔ باوجودیکہ اس راستہ میں ان کے لئے بڑی بڑی رکاوٹیں تھیں۔ والد کی ناراضگی اور غصہ کے ماحول کی عدم مفاہمت۔ درسیات کا بوجھ۔ یہ سب کچھ ایسا تھا کہ کسی دوسری طرف دھیان دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ تاہم مولانا کی فطری مناسبت جو علم و ادب سے ساتھ ان کو تھی۔ برابر اپنا کام کرتی رہی۔ ان ہی دنوں انہیں شاعری کا شوق ہوا۔ اور اس قلیل عرصہ میں شعر گوئی کی مشق کرنے لگے۔ ان کی عمر کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرتا تھا کہ یہ لڑکا جو دیکھنے میں بہت کم سن نظر آتا ہے۔ ایسے بلند پایہ اشعار بھی کہہ سکتا ہے۔ اسی وقت ہی مولانا کے اشعار وقت کے اہم اور معیاری رسالوں میں شائع ہونے لگے تھے۔ اپنی شاعری کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے مولانا نے لکھا ہے:۔

"یہ عجیب بات ہے کہ درسیات سے باہر جس چیز سے سب سے پہلے میں آشنا ہوا۔ وہ شاعری تھی۔ مجھے یہ ٹھیک یاد نہیں پڑتا کہ پہلے پہل کیونکر میں اس چیز سے واقف ہوا۔ لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ زیادہ شوق اس کا مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی ایک شخص کی وجہ سے ہوا۔ جو مولوی محمد فاروق چڑیا کوٹی کے ایک مستعد شاگرد تھے۔ اور اردو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے..... اس وقت میری عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس زمانے میں کلکتہ میں ایک بڑا مشاعرہ ہوا تھا۔ اس کا انتظام پٹنہ کے بادشاہ نواب نامی ایک رئیس نے کیا تھا۔ اس لئے کلکتہ سے باہر کے بھی مشہور استادوں مثلاً جلال مرحوم بلائے گئے تھے۔ جو طرحیں دی گئی تھیں۔ جن میں ایک یہ تھی ؎

مطلب کی بات صاف کہیں کیا مجال ہے

تین دن تک مشاعرہ مسلسل جاری رہا تھا۔ عبدالواحد نے غزلیں لکھی تھیں۔ اور مشاعرہ میں پڑھی تھیں۔ انہوں نے اس کا حال ہم لڑکوں کو سنایا۔ اپنی غزلیں بھی سنائیں یہ پہلی نظم تھی جو میرے حافظہ میں شاعری کی سند پائی جاتی ہے"

ایک اور جگہ اپنی شاعری کا ذکر [illegible] خط میں اس طرح اظہار کیا ہے:۔

"اسی زمانہ میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر خاں شوخ رامپوری کلکتہ میں مقیم تھے۔ انہیں کسی طرح یقین نہیں ہوتا تھا کہ جو غزلیں میں سناتا ہوں۔ میری ہی کہی ہوئی ہیں۔ ایک دن مسجد سے نکل رہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ مجھے پکڑ کر ایک کتب فروش کی دوکان پر لے گئے جس کی دکان مسجد سے متصل تھی۔ کہنے لگے تمہارے شاگرد نے جان عذاب میں ڈال دی ہے۔ جو شعر اسی وقت کہہ دو۔ میں سمجھ گیا۔ امتحان لینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے زمین بتلائی۔ یاد نہیں۔ شاید میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے چھ شعر لکھ دیے کہنے لگے۔ اشعار کی تعداد طاق ہونی چاہیے: میں نے ایک شعر اور کہہ دیا۔ ؎

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی ان کو کبھی یاد نہ ہو

کہنے لگے۔ صورت سے تو دس بارہ برس کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو۔ لیکن خدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی۔ اس وقت سوچتا ہوں۔ تو یہ معاملہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کل کی بات ہو"

لیکن مولانا کو شعر و شاعری کا ذوق کچھ زیادہ عرصہ نہیں رہا۔ اور انہوں نے جلد ہی یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ یہ بہت ممکن تھا۔ کہ اگر مولانا کی طبیعت آئندہ بھی اس طرف راغب رہتی تو وہ دنیائے شاعری میں بھی اپنا ایک مستقل مقام اور مرتبہ حاصل کر لیتے۔ لیکن انہیں تو ہر راہ میں کام فرسائی کرنی تھی۔ ہر میدان میں قدم بڑھانے تھے۔ ہر وادی کی خاک اڑانی تھی۔ ان کا مزاج کسی ایک پہلو پر پُر سکون ہو کر بیٹھنا جانتا ہی نہ تھا۔ چنانچہ جلد ہی وہ صحافت کی طرف راغب ہو گئے۔ صحافت کا پہلا تجربہ ایک گلدستہ کی شکل میں کیا۔ جس کو ان کی شاعری کا نقش آخر دیا جا سکتا ہے

"کبھی کبھی ایسی شخصیتیں بھی دنیا کے مرسح (اسٹیج) پر نمودار ہو جاتی ہیں جن کی انانیت کی مقدار اضافی نہیں ہوتی۔ بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے۔ یعنی خود انہیں ان کی انانیت جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے۔ اتنی ہی بڑی دوسرے بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی انانیت کی پرچھائیں جب کبھی پڑے گی۔ تو خواہ اندر کا آئینہ ہو خواہ باہر کا، اس کے ابعاد ثلاثہ (Dimensions) ہمیشہ یکساں طور پر نمودار ہوں گے!

"ابو الکلام آزاد"

احمد محی الدین :-

بقیہ صفحہ ۲

"حیات جاوید" پر تنقید کی جس نے انکی علمیت کی دھوم مچا دی اور خواجہ حالی مرحوم نے مولانا کی اس پر بڑی تعریف کی اس کے بعد آپ "نیرنگ خیال" "وکیل" اور "الندوہ" کے ایڈیٹر رہے۔ آخر ۱۹۱۲ء میں ہندوستان کی صحافتی زندگی کا وہ جلیل القدر اخبار منصہ شہود پر آیا جسے دنیا "الہلال" کے نام سے یاد کرتی ہے اور جس کا کوئی پرچہ مل جاتا ہے تو دنیا دیوانہ وار اس کو خریدتی ہے۔

"الہلال" نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور اس کا اعتراف اس دور کے سب سے بڑے اور جلیل القدر عالم دین شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز نے ان الفاظ میں کیا تھا "ہم سب اصلی کام کو بھول گئے تھے "الہلال" نے یاد دلا دیا۔ "الہلال" نے مسلمانوں میں سیاسی شعور پیدا کیا حریت کا جذبہ پیدا کیا اور غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور ظالم حکمرانوں سے پنجہ آزمائی کرنے کا سبق دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے پے در پے ضمانتیں طلب کی گئیں ضبط کی گئیں۔ پریس بھی ضبط ہو گیا مگر مولانا نے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ اور "البلاغ" کے نام سے ایک دوسرا اخبار جاری کیا۔ بعد کو وہ بھی بند کر دیا گیا۔ "الہلال" کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کا پہلا پرچہ دوبارہ چھاپنا پڑا تھا اور اس کی اشاعت دو ہی تین ہفتہ میں ۲۶ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ مولانا آزاد نے پورے ملک میں اپنی تحریروں سے ایک آگ سی لگا دی جس کے نتیجے میں حکومت نے آخر میں مولانا آزاد کے خلاف یہ قدم اٹھایا۔ انہیں کلکتہ سے شہر بدر کیا گیا۔ حکومت یو پی، دہلی، بمبئی اور پنجاب نے ان کا داخلہ پہلے ہی اپنے صوبوں میں بند کر دیا تھا۔ کلکتہ سے نکل کر مولانا آزاد رانچی میں مقیم ہوئے جہاں بعد ازاں انہیں نظر بند کر دیا گیا اور ۱۹۲۰ء کے آغاز تک آپ وہیں نظر بند رہے

سیاسی زندگی کی ابتدا

نظر بندی سے رہائی کے بعد دہلی میں آپ کی مہاتما گاندھی سے ملاقات ہوئی اس وقت پورے ہندوستان میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی مسلمانوں میں بڑا اضطراب پایا جاتا تھا اور اس کی وجہ مسئلہ خلافت تھی۔ گاندھی جی کے اشتراک و تعاون نے اس مسئلہ کو ایک باقاعدہ تحریک کی شکل دی اور ان کے ہمراہ پورے ملک میں رائے عامہ بیدار کرنے کے سلسلے میں مولانا آزاد نے بڑے سفر کئے اور اپنی آتش نوائی سے ملک کو جھنجھوڑ کر غلامی کی نیند سے بیدار کیا۔ اس سلسلے میں مولانا نے ملک کے طول و عرض میں سفر کیا اور جا بجا جلسوں کو خطاب کر کے رائے عامہ کو ہموار کیا آخر اس کا نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا۔ مولانا آزاد بنگال کے مشہور لیڈر مسٹر سی، آر داس کے ہمراہ گرفتار کر لئے گئے دسمبر ۱۹۲۱ء میں گرفتاری عمل میں آئی اور اوائل ۱۹۲۳ء میں رہائی نصیب ہوئی لیکن پھر وہی سرگرمیاں تھیں، وہی دوڑ دھوپ تھی۔

کانگرس کی پہلی صدارت

مولانا آزاد نے کانگرس کی پہلی بار صدارت ستمبر ۱۹۲۳ء میں دلی کے اسپیشل اجلاس میں کی۔ اس صدارت کے دوران میں مولانا نے کانگرس کے ایک اختلاف کو جو کونسلوں کے داخلہ کے مسئلہ پر پیدا ہو گیا تھا اپنے حسن تدبیر سے رفع کیا اور پارلیمانی اور غیر پارلیمانی دونوں کاموں کو ساتھ ساتھ چلانے کا فیصلہ کر کے کانگرس کو انتشار سے بچا لیا۔

ہندوستان کی تحریک آزادی کا قافلہ آہستہ آہستہ مختلف موڑوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا فرقہ وارانہ فسادات، سیاسی اختلافات راہ میں آتے رہے اور کاروان آزادی کے بہت سے مسافر بچھڑ کر کچھ اختلافات کی بنا پر اور کچھ تھک ہار کر جدا ہوتے گئے اسی میں ایک موڑ نہرو رپورٹ کا آیا جس نے پورے ملک میں ایک تہلکہ مچا دیا اور کانگرس میں زبردست انتشار پیدا مگر مولانا آزاد اپنی جگہ قائم رہے۔

۱۹۳۰ء میں جب نمک کی ستیہ گرہ شروع ہوئی اور گرفتاریوں کا طوفان اٹھا تو اس زمانے میں مولانا آزاد نے دوسری بار کانگرس کے قائم مقام صدر کی حیثیت میں کام کیا۔ اس کے بعد جب کانگرس نے عہدے قبول کرنے کا فیصلہ کیا اس کی نگرانی کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی تو مولانا آزاد کمیٹی کے تین ممبروں میں سے ایک تھے۔

۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑ گئی اور کانگرسی حکومتوں نے اس بات پر استعفیٰ دیدیا کہ وائسرائے نے ہندوستان کی ذمہ دار حکومتوں سے مشورہ کئے بغیر جنگ میں شرکت کا کیوں اعلان کر دیا۔ پھر تو کانگرس نے ایک بار پھر حکومت سے ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ دور نہایت نازک دور تھا۔ اس دور میں مولانا آزاد کی رہنمائی حاصل کرنے کے لئے ان سے صدارت کی درخواست کی گئی۔ چنانچہ جب گاندھی جی نے مولانا سے درخواست کی تو انہوں نے اسے قبول کر لیا ۱۹۴۰ء میں رام گڑھ کانگرس کی صدارت کی۔ مولانا کا یہ دور صدارت کانگرس کی تاریخ کا سب سے نازک دور اور سب سے طویل دور صدارت ہے کوئی صدر اتنے عرصہ تک کرسی صدارت پر نہیں رہا اس دور میں دو سیاسی تحریکیں ایک انفرادی ستیہ گرہ کی تحریک اور دوسری ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک چلی اور خود مولانا دو بار جیل گئے۔

دوسری ۱۹۴۲ء کی تحریک میں پوری ورکنگ کمیٹی کے ہمراہ بمبئی سے گرفتار ہو کے قلعہ احمد نگر میں نظر بند رکھے گئے۔

اسی دور میں حکومت برطانیہ سے تین بار گفتگو ہوئی پہلی بار ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن آیا۔ پھر ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول وائسرائے ہند نے شملہ کانفرنس بلائی اور آخر میں آخری اور فیصلہ کن بات چیت ۱۹۴۶ء میں برطانوی وزارتی مشن سے ہوئی جس کے تحت ہندوستان کو آزادی دینے کے لئے ایک پلان پیش کیا گیا جو وزارتی پلان کے نام سے مشہور ہے اس کے تحت ہندوستان میں جمہوری حکومت قائم ہوئی اور ہندوستان کا دستور بنانے کے لئے مجلس دستور ساز بنائی گئی برطانوی وزارتی مشن سے گفت و شنید کے تمام مراحل مولانا آزاد کی رہنمائی میں انجام فرمائے گئے۔

وزیر تعلیم

وزارتی مشن کے پلان کے تحت پہلے اگست ۱۹۴۶ء میں عبوری حکومت بنی پھر دسمبر ۱۹۴۶ء میں مجلس دستور ساز کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا صوبہ سرحد سے اس کے رکن چنے گئے۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں آصف علی صاحب کے امریکہ میں سفیر مقرر ہونے پر آپ مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم کی حیثیت میں شامل ہوئے اور مرتے دم تک اس عہدے پر فائز رہے۔ وزارت تعلیم کا قلمدان سنبھالنے کے بعد مولانا نے ہندوستان کی تعلیمی ترقی اور اصلاح کے لئے جو اقدامات کئے وہ ایک مستقل مضمون کا موضوع ہے۔ مولانا کے پاس ثقافتی امور کی وزارت بھی تھی آپ کے دور وزارت کے اہم کاموں اور فیصلوں میں ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دینے کا فیصلہ اہم ترین ہے۔ آپ نے پیرس میں یونسکو کے اجلاس میں بھی شرکت کی اور انڈیا آفس لائبریری کے سلسلہ میں بات چیت کیلئے لندن بھی گئے تھے کی متنام۔ علاوہ پاکستان، ایران، لبنان، عراق، فرانس، اور افغانستان کے دورے بھی کئے۔ ایران، شام، ترکی اور دوسرے کئی ممالک سے ثقافتی معاہدے بھی آپ ہی کی کوششوں سے عمل میں آئے آپ نے مسلم ممالک سے ہندوستان کے تعلقات بنانے میں تاریخی پارٹ ادا کیا ہے۔

ابوالکلام آزاد کی خودداری (بقیہ صفحہ ۱۰ سے آگے)

میں نے ان کا استغراق، انہماک اور اعتکاف بھی دیکھا ہے۔ اور ان کا انشراح اور اهتزاز بھی۔ میں نے انہیں ایک "سہل" سے کائنات کے تقاضوں کو برطرف کرتے دیکھا ہے۔ اور عالم استغفار میں بحر و خار کی طرح بہتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ دنیا اور انسانی ذہن کی کوئی پیداوار ایسی نہیں ہے جس سے قفل کھولتے ہیں انہیں کوشاں نہیں پایا۔ اور کوئی مسئلہ وجود و عدم نہیں۔ جس کا انہیں نکتہ سنج نہیں دیکھا۔ اگر حالات اور آب و ہوا موافق آتے۔ تو عطیہ ذہن رسا کا مولانا نے میدار فیاض سے پایا تھا۔ اس کی نزتی اور نمائش کا اب مقام نکل سکتا تھا کہ چار پانچ ..... بلکہ شہید وس حدود، میں اس کی مثال نہ ہوتی۔ لگر وہی۔ یاس، ناموس، کا ناگزیر تقاضہ تھا۔ جس نے ان کی تمام ترقوتوں کو اٹھاکی کی حد حیکی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ اور اگر چہ ان کی اور دوسرے رفقاء کار اور ہم نفس سرباز ان رزم آزادی کی سعی نے چالیس کروڑ انسانوں کو سیاسی آزادی کا ورثہ عطا کردیا۔ مگر جو منیت ان کے گراں قدر عطیات ذہنی کی دنیا کو ملنی چاہیئے تھی۔ وہ میدان کارزار کے گرد و غبار میں روپوش ہوگئی۔

مجھے آج بھی اس کا احساس ہے کہ شاید اب بھی وہ اس میدان میں سیاست سے دامن کش ہوسکیں تو ابھی تک ذہن کے مادۂ رسا میں اتنی سرجوشی موجود ہے کہ صدیوں کی سرشاری کا اثاثہ بنیا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ امید فریب قریب کنارے لگ چکی ہے

یہاں مجھے اپنی مثنوی کے تین بیت یاد آگئے:۔

تقدیر جھکولے دے رہی تھی
بجرے کو تھپیڑے دے رہی تھی

بہتی ہوئی ندی کی روانی
ہے کوزہ میں بند زندگانی

لے جائے ہوا جدھر کا رخ ہو
موڑے نہ مڑے ہزار چاہو

وغیرہ۔ (از شگوفہ زار حیا۔ غیر مطبوعہ)

بس یہی حال ہم سب کا ہے۔ ہوا چلتی ہے اور بادبانوں میں بھر جاتی ہے۔ اب ہزار چاہو کہ کشتی کو اس روشنی کی طرف موڑ دو جہاں بندرگاہ نظر آتا تھا۔ مگر جدھر کا رخ ہوا نے باندھ دیا اسی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ کس سے شکوہ کیجئے۔ اور کس سے شکایت.....

بیچئے۔ کافی وقت آپ کا لے لیا۔

بقیہ ابوالسیاست مولانا آزاد (بقیہ صفحہ ۹ سے آگے)

"ہاں میرے بھائی۔ یہ تو درست ہے مگر کیا جواہر لال یا کسی دوسرے بڑے سے بڑے لیڈر کی اولاد کے مستقبل کے شاندار ہونے کے متعلق بھی کوئی گارنٹی دی جاسکتی ہے اور جب کہ ہم میں سے کسی وزیر کی اولاد کے متعلق بھی نہیں کہا جاسکتا کہ مستقبل میں کیا ہو۔ تو پھر آپ کی اولاد کے متعلق کیا گارنٹی دی جاسکتی ہے۔"

مولانا آزاد کی صاف گوئی کے متعلق حق پسند ادبی حلقوں نے اس وقت خوب داد دی۔ جب دہلی میں اردو کانفرنس ہوئی تو آپ نے اپنی تقریر میں کہا کہ مخالفت چھوڑ دو۔ ہندی ہندوستان کی قومی زبان ہے اس کی مخالفت الٹا نقصان پہنچانے کا باعث ہوگی۔ ہاں تم اردو کی ترقی کے لئے حکومت سے تعاون کرتے ہوئے کوشش کرتے چلے جاؤ تاکہ اردو ہندوستان میں زندہ رہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے اردو زبان اور ہندوستان کی سیاست پر بہت بڑے احسانات ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ آپ ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا آسرا تھے۔ مگر آپ نے اپنی وزارت کے زمانے میں مصنفین شعرا اور اخبار نویسوں کی ماہوار لٹریری پنشن مقرر کرنے کا جو قانون پاس کرایا اور اب ایک سو کے قریب اہل قلم سرکاری خزانہ سے پنشن لے رہے ہیں یہ ہندوستان کی تمام زبانوں اور لٹریچر پر بہت بڑا احسان ہے جس کی پیروی دوسرے ممالک کو بھی کرنی چاہیئے۔ تاکہ اہل قلم مالی پریشانیوں سے نجات حاصل کرتے ہوئے لٹریچر کی خدمت انجام دے سکیں اور آپ کے اس احسان کو ہندوستان کی آئندہ نسلیں بھی فراموش نہ کرسکیں گی۔

آئین جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اور اب مجھے بھی اپنا دوسرا کام ہے
ہیچ آسانگ پیراہن ہے یہ کلک نفس
از سرنو زندگی ہو کر رہا ہو جائیے
خدا جانے، غالب پہ کیا گزرتی ہوگی۔

جو یہ شعر زبان پر آگیہ چند سطر کے لئے یہاں کیوں نہ آجاتے۔ والسلام آصف علی

چین کے حمدرد آنکھیں کھولیں: (صفحہ ۳ سے آگے)

چین نے خود تو بر علاقہ ہندوستان کا اپنے قبضے میں کیا ہے اس کے علاوہ اب پاکستان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے کشمیر کے سوال پر بھی اپنے آپ کو غیر جانبدار ظاہر کرنا شروع کیا ہے اب تو چین کے ہمنواؤں اور ہمدردوں کی آنکھ کھلنی چاہیئے۔ اور ان کو سمجھ آنی چاہیئے کہ وہ ہندوستان پر ہر طرح کا ناجائز دباؤ ڈال کر اپنی جارحیت کی پردہ پوشی کرنی چاہتا ہے پاکستان کو یہ کہہ کر خوش کرنے کی کوشش ہے۔ کیا کمیونسٹ نواز عنصر اب بھی کمیونسٹوں کی فریب وہ چالوں کا شکار رہے گا۔ ہندوستان میں اگر کوئی آواز پاکستان سے دوستی کے لئے اٹھتی ہے تو کمیونسٹ نواز عنصر چلا اٹھتا ہے۔ کہ پاکستان فوجی گٹھ جوڑ میں شریک ہے اس لئے اس سے دوستی ٹھیک نہیں۔ لیکن اب کمیونسٹوں کا باوا آدم پاکستان سے دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ تو کمیونسٹ نواز عنصر کے منہ پر تالے پڑ گئے ہیں۔ نہ کوئی بولتا ہے۔ نہ کسی کا قلم اٹھتا ہے۔ ہندوستان کے عوام کی نظروں سے حقیقت کو زیادہ دیر تک دور نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ راز اب فاش ہو چکا ہے کہ یہ ہندی چینی بھائی بھائی پکارنے والے ملک کو صرف فریب دے رہے تھے اب تو عذری کرتے تھا ہمیں وزیر دفاع نے بھی چین کی

Regd No. D-1196 Vol. VII. 'ASIA' Urdu Weekly. No. 1 3 March, 1961

"ASIA"

URDU WEEKLY

(Editor : Mir Mushtaq Ahmad)

Independent - patriotic - progressive

Annual	:	**Rs. 9.00**
Single Copy	:	**20 nP.**

یقین کیجئے یہی تھے ایڈیٹر الہلال کلکتہ
۱۹۱۲ء میں
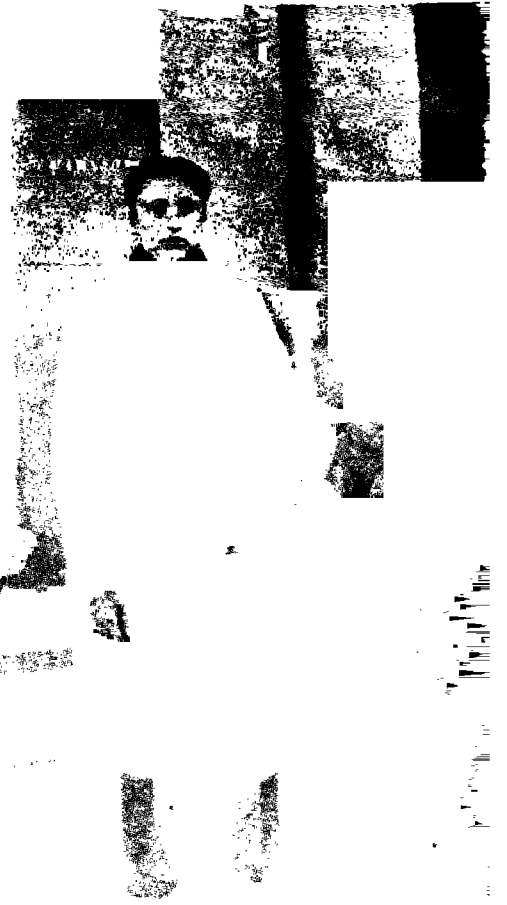
تردامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں
مولانا ابوالکلام آزاد
۱۹۱۲ء

انداز جنوں کونسا ہم میں نہیں مجنوں
پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے